آصف فرخی

برقی کتب

آتش فشاں پر کھلے گلاب

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

آتش فشاں پر کھلے گلاب

آصف فرّخی

برقی کتب

طارق پبلی کیشنز
۱۶-بی الہلال سوسائٹی کراچی

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل — سنہ ۱۹۸۲ء

تعداد — ایک ہزار

مطبوعہ — آئیڈیل پیکیجز کراچی ۱۸

قیمت — پچیس روپے

پتہ

طارق پبلی کیشنز ۱۶-بی الہلال سوسائٹی کراچی

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), New Delhi.

Rekhta

اپنے دادا

محمد احسن

کے نام

جن کی ذات میں

پوری ایک تہذیب کارفرما نظر آئی

rekhta
SAQI
Scanned with CamScanner

مُندرجات

۱	آخری اور پہلی کہانی	۹
۲	خواب اور عذاب	۱۱
۳	چیل گاڑی	۱۵
۴	شیطان کا چرخہ	۲۷
۵	دفینہ	۵۴
۶	ہیرے جیسی کہانی	۸۸
۷	خوشبو کے سوداگر	۱۰۷
۸	رات کی رانی	۱۲۴
۹	یادوں کے پردیس	۱۵۳
۱۰	آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا	۱۸۰
۱۱	غزالِ رمیدہ	۱۸۳
۱۲	ناقۃ اللہ	۱۸۹
۱۳	شرم الشیخ	۱۹۶
۱۴	بوڑھ کہانی	۲۰۱
۱۵	کہانی ختم	۲۱۰
۱۶	شہر جو کھوئے گئے	۲۲۰
۱۷	ساتواں دن	۲۲۴

Scanned with CamScanner

برقی کتب

آغاز داستان

خواتین و حضرات

آپ کا پائلٹ آپ سے مخاطب ہے۔ اس وقت ہم آواز کی رفتار سے تیز پرواز کرتے ہوئے رفعتِ خیال کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حفاظتی پیٹیاں کھول دیں اور ذہنوں کو آزاد چھوڑ دیں ـــــ

Scanned with CamScanner

آخری اور پہلی کہانی

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ روشنی اندھیرے میں گھلتی جاتی تھی، چڑیوں نے درختوں میں رین بسیرے ڈھونڈنے شروع کر دیئے تھے اور رات کا سکون چھا جانے سے قبل شہر میں گہما گہمی کا ایک دور دورہ تھا ——— دفتروں سے واپس لوٹتے ہوئے لوگ، پارک میں کھیلتے بچے، سڑکوں پر چہل قدمی کرنے والے عمر رسیدہ شہری، خوش گپیوں میں مصروف نوجوان اور سرمئی آسمان میں ٹھیرا ہوا ننھا سا نقطہ نظر آنے والا طیارہ جس میں سے شہر چیونٹیوں کا بِل معلوم ہو رہا تھا جہاں چیونٹیاں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ وقتِ مقررہ، بٹن پر ہلکا سا دباؤ، لاکھوں بجلیاں چمکیں، کوندے لپکے، ذرّے نے اپنا جوہر دِکھایا پھر دھوئیں کے بادل نے پھیل کر سانپ چھتری کی شکل اختیار کر لی۔ پھیلتی ہوئی گاما شعاعیں اور موت کی تاب کاری۔

دور کے گھنے جنگل میں انہوں نے غیر معمولی گرمی اور روشنی محسوس کی۔ پیڑوں کی چھال سے ڈھکے غاروں کے آگے بیٹھے ہوئے وہ پتھر کے

Scanned with CamScanner

اوزاروں پر دھار رکھ رہے تھے کہ انہیں اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے شکار کی تلاش میں جانا تھا۔ جاتے جاتے وہ رُک گئے اور حیرت کرنے لگے۔ موسم کی یہ تبدیلی شکار کے لئے اچھا شگون ہوگی، ان میں سے ایک نے کہا اور وہ جنگل کے راستے پر چل پڑے جس پر چل کر پُرانے لوگ آگے گئے تھے۔

(۱۹۷۸ء)

خواب اور عذاب

جب وہ انکار کے نشے میں حد سے سوا بدمست ہو گئے تو خدا نے ان پر عذاب بھیجا۔ ایسا عذاب جس نے اِن کی زندگیوں کی بے رنگ اور اُکتا دینے والی یکسانیت کو درہم برہم کر دیا، ان کا سکون غارت کر دیا۔ مگر نہ تو ان پہ چٹانوں سے پتھر برسے نہ آسمانوں سے آگ، نہ زمین کے طبقے ہلے نہ تیز و تند آندھیوں نے ان کی جڑوں کو اُکھیڑا، نہ دہلا دینے والی آوازوں نے ان کو گھیرا۔ ان پر یہ عذاب نازل ہوا کہ وہ خواب دیکھنے لگے۔ رات دن، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے ان کو خواب نظر آتے، بھیانک اور خوف ناک خواب جن کو دیکھ کر ان کی چیخیں نکل جاتیں، دہشت سے گھگھی بندھ جاتی، دانت کٹکٹانے لگتے، وہ بے حال ہو جاتے۔ ایک خواب ختم نہ ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ..... اس سے بھی بدتر، اس سے بھی زیادہ خوف ناک ..... وہ دیکھتے کہ ان کے جسم پتھرا رہے ہیں، دریا سیلاب میں اُبل رہے ہیں، زمین دھندا اور دھوئیں میں کھو گئی ہے، کبھی اپنی جگہ بدل رہی ہے، بھیڑیئے اور لکڑ بگھے ان پر خوخیا رہے ہیں، ان کی عورتیں لمبے سُرخ ناخنوں والی ڈائنیں ہیں، ان کے بچے مرگھٹ میں رات گئے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر

سفلی علم پڑھ رہے ہیں اور شیطان کے سکھائے ہوئے ہیں، ان کی بستیاں زمین میں دھنس رہی ہیں، کبھی وہ آدمی سے بندر بنے جا رہے ہیں، ان کے ہاتھ پیر ٹوٹ کے جھڑ رہے ہیں جیسے کچی مٹی کے بنے ہوں، وہ خلاؤں میں اُڑے جا رہے ہیں، شور سے ان کے کان پھٹے جا رہے ہیں، اندھیرا اُن کو نگلنے کے لئے بڑھا چلا آتا ہے ..... وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھتے، ٹھنڈا پانی پیتے، ذرا دم میں دم آتا، سانس ٹھہرتی، جی سنبھلتا، پھر جونہی دوبارہ لیٹ کر آنکھیں بند کرتے وہی خواب آنکھوں میں پلٹنے لگتے، ٹوٹتے ہوئے گلے سڑے جسم، ننگی پرچھائیاں، خوں خوار درندے، گھٹا ٹوپ اندھیرے، سرکتی ہوئی زمین، ڈولتا آسمان، عدم تحفظ، بے یقینی، عمومیت کے بجائے تجرید۔ جانی پہچانی چیزیں اَن جانے روپ اختیار کرنے لگتیں، گڈمڈ ہو جاتیں، حواس کی گرفت سے باہر نکلنے کے لئے تڑپنے مچلنے لگتیں کہ وہ خواب کے اندر ہی حیرت و خوف سے گنگ رہ جاتے ..... وہ پھر چیختے۔

ایک ایک کر کے یہ بیماری سب کو لاحق ہو گئی۔ اس کا پہلا شکار وہ اندھا بوڑھا بھاٹ ہوا جس کو سب کے شجرے یاد تھے اور جو رات گئے الاؤ کے گرد بیٹھ کر نوجوانوں کو پچھلی جنگوں کی بہادری کی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اس کو خواب دکھائی دینے لگا کہ کہانیاں ویسی نہیں ہیں جیسی وہ سنا رہا ہے، سب کچھ غلط ہے، اور اندر ہی اندر کہیں اُس اصل کی طرف جو منبع و ماخذ ہے وہاں سب بدل گیا ہے، کہانیوں میں جیتنے والے اصل میں ہار چکے ہیں، کہانیوں کے بہادر شہزادے دیو ہیں اور کم سن نازنین شہزادیاں روپ بدلے ہوئے

بھُتنیاں۔ اس نے مسلسل یہ خواب دیکھنا شروع کیا، سارے بہادر ہلاک ہوجائیں گے، تندرستوں کو روگ لگیں گے امیر وغنی محتاج و مفلوک ہوں گے، ظالم جادوگر جیت جائے گا، بوڑھا بادشاہ رو رو کے اندھا ہوجائے گا، شہزادوں کے کٹے ہوئے سر اس کے سامنے طشت میں رکھ کے گھمائے جائیں گے، لوحِ طلسم سیاہ پڑ جائے گی، گلِ بکاؤلی کسی کو نہ مل سکے گا۔ اس کے بعد سردار کا بیٹا بُرے خواب دیکھ کر دہشت زدہ ہوا۔ پھر یہ عذاب ناک بیماری سب میں پھیل گئی۔ بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے، بہادر شکاری اور بزدل گویئے، سردار اور مزدور سب بدخواب دیکھنے لگے۔ تب اُنہوں نے اپنے اپنے خواب ایک دوسرے سے کہنے شروع کئے۔ جہاں دو آدمی مل بیٹھتے اپنے بدخواب سنانے لگتے۔ ایک کہتا "میں نے رات کو دیکھا کہ سڑی ہوئی لاشوں کے ڈھیر کے نیچے پڑا سسک رہا ہوں۔ میرا مُنہ پیپ اور خون سے لتھڑا ہوا ہے اور طاعون زدہ لاشوں کی سڑاند سے میرا دم گھُٹا جارہا ہے، مُردہ چوہے اور مسخ شدہ انسانی لاشیں میرے اُوپر پڑی ہوئی ہیں، ان سے گھبرا کر چیخنا چاہتا ہوں تو خون اور پیپ سے میرا منہ بند ہوجاتا ہے۔"

دوسرا کہتا "میں نے خواب دیکھا کہ دنیا آدمیوں سے پٹ گئی ہے، کھوے سے کھوا چھِل رہا ہے، تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہے، آدمی پہ آدمی گرا پڑا ہے، کھانے کا کال پڑ گیا ہے اور آدمی کا گوشت آدمی کھا رہا ہے۔"

مگر ایک دن اندھے بھاٹ نے اتنا بھیانک خواب دیکھا کہ وہ تھرّا اُٹھا۔ اس کی چیخیں سن کر سب اس کے خیمے کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ مرگی زدہ مریض

کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کے سارے جسم پر پسینے چھوٹے پڑ رہے تھے۔ دہشت سے اس کی آنکھیں باہر کو اُبلی آ رہی تھیں، رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دانت بھنچ گئے تھے ..... خواب، خواب، میرا بد خواب، وہ چیخا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کو لخلخہ سنگھایا گیا، پنکھوں سے ہوا جھلی گئی۔ جب اس کو ہوش آیا تو ان میں سے ایک نے بڑھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا، تم نے کیا دیکھا؟"

"دہشت ناک خواب ....." اس نے خواب کے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں نے بے حد خوف ناک خواب دیکھا ---- میں نے دیکھا ------ میں نے دیکھا ---- کہ ہر طرف چاندنی چٹکی ہوئی ہے، سفید دودھیا چاندنی، پُروائیاں چل رہی ہیں، پھول کھلے ہیں، زرد اور سرخ، اور ان کے درمیان ننھے ننھے بچے اپنے گالوں جیسے لال سیب کُترتے پھر رہے ہیں اور ان کے ساتھ میمنے ہیں جن کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں ہیں ---- اور، اور ---"

وہ آگے نہ کہہ سکا، خواب کی دہشت اس پر غالب آ گئی اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

ان لوگوں نے اتنے بد خواب دیکھے تھے کہ وہ ان کے خُوگر ہو گئے تھے مگر اس اندھے بھاٹ کا خواب سن کر وہ سراسیمہ ہو گئے کہ اتنا دہشت ناک بد خواب کسی نے اب تک نہ دیکھا تھا ..... چاندنی اور پھول اور ننھے بچے اور ٹھنڈی ہوا .....

۱۹۷۹ء

Scanned with CamScanner

چیل گاڑی

۱۹۳۰ء کی دہائی اپنے اختتام کی جانب تیزی سے گامزن تھی، عالم گیر جنگ کے بادل گھر آئے تھے، تقسیم ہند کا غلغلہ ابھی بلند نہ ہوا تھا اور ہندوستان ہوائی جہاز سے ابھی تک مانوس نہ ہوا تھا ـــــ ہوائی جہاز کو اتنی انوکھی چیز بلکہ عجوبہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی گڑگڑاہٹ سُن لیتے تو لوگ اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر باہر کھُلے میں آنکلتے اور اسے اس وقت تک تکتے رہتے جب تک کہ آسمان کی طرف منہ اُٹھائے اٹھائے ان کی گردن نہ تھک جاتی یا جہاز آسمان میں تیرتا ننھا سا نقطہ بن کر افق کے پار گم نہ ہو جاتا ـــــ کہ اسی زمانے میں ہندوستان کے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے ضلع فرخ آباد میں ایک جہاز گر پڑا۔ یہ چھوٹا سا گلائڈر تھا جس وضع کے جہاز اب کھڑی فصلوں پر جراثیم کُش دوائیں چھڑکنے یا ہوائی سروے کرنے کے کام آتے ہیں اور جیٹ جہازوں کے اس دور میں اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر لوگ حیرت سے تکتے رہ جاتے ہیں۔ جہاز کے گرنے کا ضلعے بھر میں شہرہ ہو گیا کہ آسمان سے چیل گاڑی گر پڑی۔ کنٹونمنٹ

Scanned with CamScanner

کے پریڈ گراؤنڈ میں یہ جہاز، بلکہ دیہاتیوں کے بقول "چیل گاڑی" گری تھی، وہاں میلے کا سماں ہو گیا۔ کہاں تو پریڈ گراؤنڈ خالی پڑا رہتا تھا کہاں یہ عالم کہ دس دس پندرہ پندرہ کوس سے، دیہاتی گنوار گسائیں گسائیں کرتے بیل گاڑیاں ہنکاتے چیل گاڑی دیکھنے چلے آتے ہیں۔ گڑسہائے گنج سے، نوکھڑے سے، فتح گڑھ سے، کمال گنج سے، گریا کھارے سے، قائم گنج سے اور ضلع کی آخری حد کمپل سے جو تاریخ کا کپل وستو ہے، اور آس پاس کے تمام دیہات سے ہزارہا گنوار گنوارنیں غول کے غول، غٹ کے غٹ، گھوڑوں اور گدھوں پر سوار یا پیادہ پا چلے آتے ہیں۔ کہیں کوئی آپ اپنا ٹٹو ٹخ ٹخ کرتا اکیلا چلا آتا ہے تو کہیں گاؤں کے زمیندار جی مصاحبوں، خوشامدیوں اور مزارعوں کی برات کے دولہا بنے چلے آتے ہیں، آگے آگے آپ شان سے گھوڑی پر چڑھے ہیں، سر پہ طرہ کمر میں پٹکا، آنکھوں میں سرمہ، گھوڑی دلکی چال سے چلی جاتی ہے، پیچھے پیچھے مزدور اُن کا سامان اُٹھائے ہوئے گنواروں کی ایک پوری فوج چلی آتی ہے، گردیں اٹے چمر ودھے جوتے، بعضے ننگے پیر، دھوتیاں مرزائیاں پہنے، لٹھ تھامے، ڈم ڈما ڈم ڈمرو بجاتے ہوئے دیہاتی، ان کے سنگ میں ان کی گنوارنیں، گاڑھے کی کرتی گاڑھے کی چدر، لہنگے پھڑ کاتی، کڑے ہنسلیاں جوشن بجاتی، بچوں کی ہیڑی ساتھ میں، کاؤں کاؤں چاؤں چاؤں کرتے، ہرے نیلے کپڑے پہنے لال پیلے بچے، زیور سے گوندنی کی طرح لدے، روتے ٹھنگنے بچے، عورتوں کے پیچھے دیہات کے شوقین جوان، بانکی وضع، رنگے ہوئے کرتے، ریشمی تہہ بند، بڑے بڑے

پگڑ، کلّے میں پان، آوازے کستے، بولیاں ٹھولیاں کرتے، دو چار برہمن پوتھیاں سنبھالے، ستاروں کی چال دیکھتے، شُبھ گھڑی اور نحس ساعت بتاتے، برہمنوں کی ہر بات پر تائید میں سر ہلاتے ہوئے تاجروں کے گماشتے کارندے اسباب چھکڑوں پر لادے چلے آتے ہیں۔ غرض پورا گنوَر دَل اکٹھا ہوگیا اور دو دن میں گنواروں کا میلہ لگ گیا۔ ان کے پیچھے سودا بیچنے والے، پھیری والے، رنڈیاں، گشتی تھیٹر، خوانچے فروش، ٹھگ، نوسر باز اور کرتب دکھانے والے نٹ جمع ہو گئے اور چند دن تک خوب میلہ جما۔ کچھ عرصے بعد انگریزی سرکار نے جہاز اٹھوا لیا اور قصّہ ختم ہوگیا۔ جہاز عام ہو گئے، لوگ باگ اس بات کو بھول بھال گئے، لیکن چیل گاڑی کا گرنا ہمارے خاندان کی تاریخ میں ایک نہایت اہم واقعے کی حیثیت اختیار کر گیا کہ اپنی انفرادی اہمیت کے علاوہ ایک کیلنڈر اِوینٹ کی حیثیت سے بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس بے حد اہم حادثے سے دوسرے واقعات کی تاریخ بھی متعین کی جاسکتی ہے۔ بچّوں کی پیدائش، جوانوں کی عمر اور بوڑھوں کی موت کا حساب اس کے حوالے سے رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر پھُپھی کلثوم کی عمر پوچھنی ہے تو اس کا حساب یہ ہے کہ جب چیل گاڑی گری تھی تو پھُپھی کو انگنا برس لگا تھا، اب حساب لگا لو، اور اگر یہ پتہ کرنا ہے کہ آفتاب ماموں کے یہاں شادی کے کتنے برس بعد اولاد ہوئی تو خاندان کی کوئی بھی بڑی بوڑھی بتا دے گی کہ جب چیل گاڑی گری تھی تو شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ اس طرح کوئی پرانی بات یاد کی جاتی ہے تو یوں کہ یہ اس وقت

کی بات ہے جب چیل گاڑی گری تھی یا اس سے پہلے کی۔ لہٰذا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حادثے کی وہ اہمیت ہے جو یورپ کی تاریخ میں نیوٹن کے سر پر سیب گرنے کی۔

لیکن اس حادثے کے تاریخی اہمیت حاصل کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی: ہمارے خاندان میں چیل گاڑی کو شہرت اس لئے بھی ملی کہ اکبری خالہ نے چیل گاڑی دیکھنے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر انہوں نے انکار نہ کیا ہوتا تو یہ سارا معاملہ خاندانی کرانیکلر کا حصہ نہ بنا ہوتا، پہلے چیل گاڑی گری، پھر اکبری خالہ نے انکار کیا اور ہر دو حادثات کی بازگشت اب تک سُنی جا سکتی ہے۔ ۳۰ء کی دہائی سے لے کر آج تک اکبری خالہ ان کی تفصیلات اسی طرح سنایا کرتی ہیں۔ جہاں دو چار آدمی جمع ہوئے اور کسی نے تفریح لینے کے لئے اُنہیں چھیڑا "کیوں خالہ وہ جب چیل گاڑی گری تھی اور تم اِکّے پر بیٹھ کر اسے دیکھنے گئی تھیں۔۔۔۔"

وہ فوراً جواب دیتیں "کوئی نہیں۔ میں تو نہ گئی تھی، صاف منع کر دیا تھا۔ میں اپنے مرد لنے کے بغیر گھر سے باہر تک نہ نکلوں۔"

اکبری خالہ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا کہ ان کی تخلیق کی زحمت اللہ میاں نے خود اُٹھانے کے بجائے اپنے کسی اسسٹنٹ کے سپرد کر دی تھی، جس نے تمام مانختوں کی روائتی لاپروائی سے کام لیتے ہوئے خالہ اکبری بے چاری کو اَدھ بنا ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ قد کاٹھ کی چھوٹی تو چھوٹی، نیت کی کھوٹی اور عقل کی موٹی۔ اور ان کے شوہر قدوس خالو، جنہیں وہ

اپنا مردانہ کہتی تھیں، وہ بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے، جو چاہو ان سے کہہ دو وہ بس اپنی چُگّی داڑھی ہلا دیں گے۔ بُدّھی نام کو نہیں، اس لئے بیوی کو عقلِ کُل سمجھتے تھے چنانچہ نہایت کم ترین شوہر تھے۔ گھر بار کے کام میں اکبری خالہ برق تھیں، دن بھر اِدھر سے اُدھر اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں میں کھڑاویں کھڑکاتی کُھٹ کُھٹ کرتی پھرتیں، لیکن جہاں گھر کے باہر کا کام آیا، چاہے نُکڑ کی دوکان سے ایک پیسے کی لال مرچ ہی کیوں نہ منگوانی ہو، وہ ہاتھ پیر چھوڑ دیتیں اور انہیں "اپنے مردانے" کی ضرورت پڑ جاتی۔ ان کے "مردانے"، مارے تابعداری کے فوراً حاضر ہو جاتے۔ جہاں کسی نے اکبری خالہ سے کہا کہ فلاں کام کر لیا ہوتا یا فلاں جگہ ہو آتیں تو وہ پٹ سے جواب دیتیں "نہ بھیّا، میں اپنے مردانے کے بغیر گلی میں قدم باہر نہ نکالوں۔ وقت پڑے گا تو اپنے مردانے کا ہاتھ تھامیں گے"۔ ہم لوگ شرارتاً قدّوس خالو کو "اکبری خالہ کا مردانہ" کہا کرتے تھے۔ اپنے مردانے کے بغیر خالہ اکبری اور بھی زیادہ بے بس نظر آتی تھیں۔ کم عقل اور ڈرپوک تو وہ یوں بھی تھیں، اپنے مردانے کے بغیر وہ نہ تو کوئی فیصلہ کر سکتی تھیں نہ کوئی رائے دے سکتی تھیں، نہ کہیں آجا سکتی تھیں، نہ کوئی کام کر سکتی تھیں۔ ایک خالہ اکبری کیا، اس زمانے کی نیک بیبیاں ایسی ہی ہُوا کرتی تھیں۔

ہمارے گھر والوں میں خالہ اکبری کو بہت عقل مند سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ واحد خاتون تھیں جو مردانہ قمیص سی سکتی تھیں، لیکن ہم بچّے ان کے ہاتھ کے سِلے ہوئے بھیلے نما غلافوں سے تنگ آکر، جو ہمیں مجبوراً

پہننے پڑتے تھے، اور ان کے بلّے پن سے فائدہ اُٹھا کر ان کے نتھنوں میں تیر پہناتے رہتے۔ کچھ اور نہیں ملا تو چیل گاڑی کا قصہ ان پر لڑھکا دیا جاتا" اچھا تو پھر خالہ جب تم چیل گاڑی دیکھنے گئیں اس کے ساتھ تو کیا ہوا؟"

اتنا سُننا تھا کہ خالہ اکبری جو تُلی بیٹھی ہوتیں، چابی بھرے باجے کی طرح چل پڑتیں "بس تم لوگ پھر کہنے لگے۔ یونہی بات بناتے ہو، میں تو نہ گئی تھی۔"

"گئی تو تھیں" ہم اصرار کرتے۔ "اب مان بھی لو، کوئی کچھ نہیں کہے گا" کسی نے چھیڑا۔

"لے نوج جو میں گئی ہوتی۔ جاتی میری جوتی۔ میں تو اپنے مردانے کے بغیر گھر سے باہر پیر نہ نکالوں"

"نہیں گئی تھیں تو چلی گئی ہوتیں، کون سا تمہارے کنوار پنے میں بٹہ لگ جاتا۔ ذرا تماشہ ہی رہتا" بڑی چچی نے لقمہ دیا۔ بچے تو بچے، بڑے بھی ان سے خوب تفریح لیتے تھے۔

"نہ بھیا میرا ایسا ہوائی دیدہ نہیں ہے۔ میں نہیں جاتی اپنے مردانے کے بغیر"

"مگر وہ میٹھوا اِکے والا جو تمہیں لئے جا رہا تھا۔۔۔"

"ائے اس کلموُنہے کے جُھلسا لگاؤں، لُو کا دوں کم بخت کو۔۔۔"

سب نے دیکھا کہ خالہ اکبری اب اپنے فارم میں آ گئیں تو کسی نے انجان

Scanned with CamScanner

بن کر پوچھا "اچھا تو ہوا کیا تھا؟"

"ہوا ہوایا کچھ نہیں۔ یونہی وہ مُونڈی کاٹا سب میں بکتا جھکتا پھرا۔ میرا صبر پڑے اس پر، کہیں چین نہ پائے، غارت ہو جائے۔ تمہارے خالو فصل کا سودا کرنے غلّہ منڈی گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلی تھی، بس اوپر کا کام کرنے والی ماما تھی، فہیمن تھی جو کھانا پکاتی تھی اور باہر کے مکان میں تمہارے خالو کا منشی۔ تمہارے خالو جاتے وقت احمدی بیگم سے کہہ گئے تھے کہ ہمارے گھر میں سے اکیلی ہیں، میں جا رہا ہوں، ہفتے بھر میں لَوٹوں گا اور تم ان کے پاس چلی جاؤ۔ اب بھائی میں گھر میں بیٹھی احمدی بی کی راہ دیکھ رہی ہوں، اب آتی ہیں نہ جب آتی ہیں۔ ان کے لئے خاص طور پر بُونٹ بین کے رکھے، چاول چُنے اور بُونٹ پلاؤ دم دیا کہ احمدی بی کی جان جاتی ہے بونٹ پلاؤ پر، مگر وہ نہ آنا تھیں نہ آئیں۔ اب بھیّا اکیلے گھر میں میرا جی ہَول گیا۔ ایسی سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ تم جانو میرا دل پہلے ہی کم زور ہے، کلیجہ پھڑکنے لگا۔ مردانے کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑے۔ میں نے کیا کام کرا، فہیمن کو دوڑوا کر اکّہ منگوالیا۔ سوچا کہ احمدی بی کے وہاں ہو آؤں، ایسا نہ ہو کہ نگوڑی کا جی اچھا نہ ہو، ورنہ ایسی بے مروّت تو وہ نہ تھیں کہ کہے پر نہ آتیں۔ بس صاحب یہی غلطی ہو گئی جو اکیلے جانے کا قصد کر لیا۔ تم جانو اپنے مردانے کے بغیر تو میں گلی میں پیر نہ نکالوں۔ وہ کم بخت فہیمن سدا کی نظر چوٹّی، جا کے نامراد مٹھوے اِکّے والے کو بلا لائی۔ مِٹھوا اِکّے والا ایک بد ذات۔ منہ دیکھے پہ بی بی کرے

اور پیچھے جا کر اِکّے والوں کے اڈّے میں نقل اتارے کہ بی بی اِکّے میں بیٹھیں تو وزن سے گھوڑا بیٹھ گیا اور گھوڑے نے ہاتھی برابر وزن کھینچا اور جانے پیاروں پیٹا کیا کیا بکتا۔ اب تم خود دیکھ لو جو میرا وزن ہاتھی برابر ہو، کھایا پیا جاتا نہیں، انگ لگتا نہیں، جل جل کر یہ حال ہو گیا۔" وہ اپنا بازو دکھانے کو آگے کر دیتیں۔ "میں بیٹھ تو گئی اِکّے میں، پر میرا جی کچھ ٹھک نہیں رہا تھا اس پر۔ مگر وہ جو مثل ہے کہ ہونی کو کون روک سکا ہے۔ بندے بشر کی کیا مجال۔ جو کچھ قابو ہوتا تو اتنے بڑے انگریز چیل گاڑی کو گرنے سے نہ بچا لیتے؟ سارے میں سلطنت تھی اُن کی، چیل گاڑی اُڑا لی تو اللہ کو ان کا غرور پسند نہیں آیا، دیکھو کیسی پٹخنی دی کہ سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے اور خفّت اُٹھانی پڑی سو الگ۔۔۔"

"وہ مِٹھوا اِکّے والا۔۔۔" کسی نے ان کو واپس پٹڑی پر لانے کی کوشش کی۔

"اے ہاں۔ وہ موا اکّہ لے چلا۔ چلتے چلتے اس سے کہہ دیا کہ بزریا جانا ہے چھمّن میاں کے وہاں۔ حرام زادہ سو مرتبہ مجھے وہاں لایا اور لے گیا، خوب گھر کا راستہ دیکھا ہوا تھا اس کا۔ اب جو اس نے چلنا شروع کیا تو چلے چلے جائے، یا اللہ بزریا آ نہیں چکتی، راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا۔ چھمّن کا مکان اب آتا ہے نہ جب۔ کان لگا کر سنا تو نہ لوگوں کی آوازیں نہ بازار کا غل غپاڑا نہ ہٹو بچو کا شور۔ جی دھک سے رہ گیا۔ آواز دے کر پوچھا "اے مِٹھوے، کہاں سے لئے جا رہا ہے، کون راستہ ہے جو بزریا اب

تک نہیں آئی ؟"

وہ اِدھر سے بولا، ایسی گڑگڑ آواز تھی ناس پیٹے کی، بولا "بی بی پریڈ گراؤنڈ لئے جارہا ہوں" یہ سُن کر میرے تو ہوش اڑ گئے "صاحب۔ "پریڈ گراؤنڈ؟ ارے موئے مونڈی کاٹے تیرا ستیاناس جائے، پریڈ گراؤنڈ میں میرا کون ہوتا سوتا بیٹھا ہے؟ تجھ سے بزریا جانے کو کہا تھا" وہ کہنے لگا "پریڈ گراؤنڈ نہیں چلوگی؟ چیل گاڑی گری ہے، اس کا میلہ لگا ہے، تماشہ دیکھنا چل کر" میں نے اُسی وقت کہہ دیا "چل ہٹ حرام زادے تیرے سنگ تو نہ جاؤں گی۔ میں اپنے مردانے کے بغیر کہیں قدم نہیں نکالتی۔ صاف منع کر دیا میں نے، مگر وہ کچھ بولا نہیں، چپ چاپ چلتا چلا گیا۔ اب صاحب میں ڈروں اور گھبراؤں اور حلق خشک، منہ سے ڈر کے مارے آواز نہ نکلے کہ جنیں یہ کاٹے گا، مارے گا، کیا کرے گا، اور وہ اللہ مارا بھیں بھیں گاتا چلا جائے ...."

"گانا بھی گا رہا تھا؟ بالکل فلموں کے ہیرو کی طرح؟" کسی نے پوچھا۔

"اے ہاں اور کیا۔ کم بخت کا دماغ جانو عرش پر تھا۔ نوٹنکی کا گانا تھا کوئی سانگوڑ مارا۔ ایسی بھونپا جیسی بھئوں بھئوں آواز اور زور زور گلا پھاڑ پھاڑ چلائے "لیلیٰ پیاری آئی مورے گھر میں" جنم جلا گائے جائے جانو جیسے چڑا رہا ہو۔ ادھر میں صاحب بیٹھی آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر اپنے پر پھونکوں اور سہمی سہمی جاؤں۔ سناٹے میں کوئی اور آواز تک نہ آئے

اور اِکّے میں اندھیرا، چادریں جو بندھی ہوئی تھیں پردے کے لئے۔ اندر ہی اندر میں اس وقت کو کوس رہی تھی جب اپنے مردانے کے بغیر نکلنے کا قصد کیا۔ خیر اچھی سزا پائی اس کی۔ اب میں کبھی اپنے مردانے کے بغیر نہیں نکلتی ہاں بھئی کوئی چاہے کچھ کہے، لاکھ نکّو بنائے، اللہ میرا سہاگ سلامت رکھے، وقت پڑے گا تو اپنے مردانے کا ہاتھ پکڑیں گے، غیر کا منہ کیوں دیکھیں۔۔۔۔"

"ارے اس مِٹھوے نے کیا کیا؟"

"اس کی مجال کہ کچھ کرتا۔ اُسی وقت جوتیوں سے بھیجا پلپلا کر دیتی اُس کا۔ وہ لئے جا رہا تھا جانے کہاں کہ اتنے میں تمہارے خالو کا منشی گھوڑے پر ادھر سے گذرا۔ اُس نے جو اِس موئے کو دیکھا تو گھوڑے پر سے اُتر پڑا، اور پوچھا "ابے تجھ کو تو بی بی نے بندریا ٹولے جانے کے لئے بلوایا تھا اور تو یہاں ہنڈتا پھر رہا ہے، لگاؤں ایک جھانپڑ تیرے؟" منشی کی جو آواز سنی تو میں نے کیا کام کرا، جی کڑا کر کے، اکّے کے پردے میں ذرا سا، بالکل اتنا سا پنجہ برابر ہاتھ باہر نکال دیا اور دو ایک دفعہ ہوں ہوں کی، کھانسی کھنکاری، بول تو سکتی نہیں تھی ورنہ غیر مرد آواز سُن لیتا۔ منشی سمجھ گیا کہ کچھ معاملہ ہے ضرور۔ فوراً ڈپٹ کر پوچھا "کیوں بے یہ ہمارے میاں جی کی سواریاں کدھر لئے جا رہا ہے؟" ڈانٹ جو پڑی تو جھٹ اس نے اِکّہ روک دیا اور پردے ہٹا کر اپنا منہ اندر ڈال کر کہنے لگا "چیل گاڑی کے تماشے کو نہیں جاؤ گی؟ نہ جاؤ تمہاری مرضی، میں کسی اور کو چیل گاڑی کا میلہ دکھا

لاؤں گا۔" جھاڑ و پھیرے اس کی شکل پر، ایسا کالا کالا منہ تھا اس کا، توے جیسا رنگ، لال لال آنکھیں۔ جنیں کم بخت کچھ پیئے ہوئے تھا یا کیا۔ میں ڈر کر چیخنے لگی، بیچا جیسا لگ رہا تھا منحوس۔ منشی نے دو ہاتھ مارے اس کے اور اسی وقت دوسرا تانگہ منگوا کر مجھے گھر بھجوایا۔ آپ برابر برابر گھوڑے پر آتے رہے۔ گھر پہنچتے ہی اپنے مردانے کو تار دِلوایا کہ جو اُلٹے پیروں نہ لوٹ آؤ تو میرا مرے کا منہ دیکھو۔ وہ بے چارے فوراً گھبرائے ہوئے آئے کہ جنیں کیا بپتا پڑ گئی۔ میں نے اسی وقت کہہ دیا کہ کیوں صاحب تم وہاں فصلوں کے کوڑے کرتے رہ جاتے اور جو بندی کے دشمنوں کو کوئی نکال لے جاتا تو تمہارا کیا جاتا۔ چاہے آج کو میری جان چلی گئی ہوتی، نشان کو ہڈی تک نہ ملتی تو تمہارا کیا جاتا۔ تم تو چار دن رسمِ دنیا نبھانے کے بعد نئی نویلی بیاہ لاتے۔ اسی وقت میں نے کہا کہ ابھی فوراً کے فوراً مجھے چیل گاڑی کا تماشہ دِکھوا کے لاؤ، نہیں تو صاحب تمہاری اور اپنی جان ایک کر دوں گی۔ چیل گاڑی تو دیکھنا ضرور تھی مگر ایسا کلجگ بھی نہیں آیا تھا کہ اپنے مردانے کے بغیر تماشے دیکھنے اکیلے اکیلے چلی جاؤں۔ وقت پڑے گا تو اپنے ہی مردانے کا ہاتھ پکڑیں گے۔ کوئی آج کل کی چھوکریوں کی طرح ہوائی دیدہ تو ہیں نہیں کہ مارے کھڈیرے پھرتے پھریں۔ اس وقت تو انہوں نے کہا کہ ابھی تو سفر کی تکان ہے مجھے، خدا نے چاہا تو کل لے چلوں گا۔ اگلے دن جو تانگہ منگوا کر لائے تو اس پر وہ اور ہم بیٹھ کر گئے۔ پریڈ گراؤنڈ پہنچے تو پتہ چلا کہ انگریزوں نے چیل گاڑی اُٹھوا بھی

لی۔ خالی بھٹ میدان ڈھنڈار سا پڑا تھا۔ اب تم دیکھ لو کہ چیل گاڑی آئی اور گر کر اُٹھ گئی مگر میں اکیلی نہ گئی اپنے مردانے کے بغیر، مٹھوے اِکّے والے نے بھی کہا، مگر نہ صاحب، تھامیں گے تو اپنے ہی مردانے کا ہاتھ تھامیں گے نا ----"

"بس یہی ہوا؟" وہ کہہ چکتیں تو کوئی نہ کوئی بچہ پوچھ اُٹھتا جیسے کہہ رہا ہو اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا، لیکن جب بھی وہ قصّہ سنانے پر آمادہ ہوتیں ہم اِسی انہماک سے سُننے کے لئے بیٹھ جاتے جس اشتیاق سے وہ چیل گاڑی دیکھنے گئی تھیں۔

(۱۹۷۹ء)

Converted by SAQI

Scanned with CamScanner

شیطان کا چرخہ

دادی بی کو سب سے پہلے برابر والی کوٹھی کے نوکر نے، جس سے وہ کبھی کبھار بان کے لئے چھالیہ تمباکو منگانے کے علاوہ محلّے بھر کے اسکینڈلز کی تازہ ترین صورتِ حال کی سُن گن لیا کرتی تھیں، بتایا کہ اب پاکستان میں ویسا والا ریڈیو آگیا ہے جس میں بولنے والوں کی صورتیں بھی نظر آئیں گی اور مزید یہ کہ خان صاحب کے گھر یہ عجیب و غریب چیز دو چار دن میں بس آیا ہی چاہتی ہے۔ دادی بی کو پہلے تو یقین نہ آیا اور وہ اسے تین ٹانگوں والے آدمی اور دوسروں والے گھوڑے کی قبیل کی چیز سمجھ کر "اونہہ ہوئے گا، ہٹاؤ ہمیں کیا کرنا" کہہ کر کتھے کی کُلھیا میں پانی ڈالتی رہیں، مگر جب ان کے بیٹے نے رات کے کھانے پر اس کا ذکر کیا اور ان کے چھوٹے پوتے نے ضد کی کہ ابو ہم بھی لیں گے، تو دادی بی کو تشویش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیز گھر میں آنی ہی نہیں چاہیئے جس کا کوئی اور چھور نہیں، نہ آگا نہ پیچھا، نہ ضمانت نہ اعتبار، کیا پتہ کیا کر ڈالے۔ اسی خیال سے انہوں نے صاف

Scanned with CamScanner

صاف اعلان کر ڈالا کہ جس دم یہ مُوا اللہ مارا موت پیٹا شیطانی چرخہ گھر میں آیا وہ فوراً للّو سے (جو برابر والی کوٹھی کے ملازم چھو کرے اور اس انہونی چیز کی خبر لانے والے کا نام نامی تھا) رکشہ منگا، اپنا ٹین کا بکسا، دو پوٹلیاں، طوطے کا پنجرہ، ہاتھ سے جھلنے کا پنکھا، لوٹا اور تانبے کے برتن اُٹھوا کہیں چل دیں گی۔ "اے ہاں نہیں تو، وخت بے وخت آ جا اڑ مارے بندر کی صورت فرنگیوں کی لال لال شکلیں دیکھے جاؤ۔ گھر کی بالیاں بچیاں ننگے سر اور کھلے منہ بیٹھی ہوں اور یہ وہ غیر مردوئے اس نگوڑ مارے چرخے کے اندر سے تاکا جھانکی لگا دیں تو کون اُن کا ہاتھ پکڑے گا؟" بہو بیگم ذرا چڑ کر کہنے بھی لگیں "اماں آپ کمال کرتی ہیں، ابھی گھر میں کچھ آیا نہ گیا، آپ نے بکنا جھکنا شروع کر دیا۔ آپ کی تو وہی مثل ہے کہ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔" مگر دادی بی کا کہنا یہ تھا کہ "تم انگریزی پڑھے لوگ کیا جانو۔ گِٹ پٹ کرنا کیا سیکھ لیا ہے اپنا اچھا بُرا بھول گئی ہو، بزرگوں کو چٹکیوں میں اُڑانے لگی ہو، آخر کو ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے، دھوپ میں تو بال سفید نہیں کیے۔" دادی بی کہتی کی کہتی رہیں کہ "اے بی یہ چیزیں اچھی نہیں جن کے بارے میں نہ سُنا نہ جن کو اب تک دیکھا بھالا" مگر ان کی سنتا ہی کون تھا۔ آپ ہی آپ بکے گئیں۔ پاندان کی کلھیوں اور پیک دان نے سنا ہو تو سنا ہو۔ ویسے تو دادی بی کو اپنی دونوں پوتیوں شکیلہ اور جمیلہ کا بے پردہ گھومنا پھرنا بے انتہا ناگوار گذرتا تھا۔ ہزار دفعہ ٹوک چکی تھیں مگر یہ دیکھ کر

Scanned with CamScanner

چپ ہو رہتیں کہ اچھے اچھوں کی بہو بیٹیاں ماماؤں اصیلیوں کی طرح آگا پیچھا کھولے پھر رہی ہیں، اور وہ اس بے پردگی کو پاکستان بننے کے بعد ہونے والی اُٹھا پٹخ کا کرشمہ قرار دینے لگتیں جس نے خود انہیں یوپی کے شہر سندیلے سے ہزاروں میل دور کراچی میں دھر پٹخا تھا، جس کا نام تک انہیں اجنبی معلوم ہوتا۔ وہ کہتی رہتیں کہ "ائے یہ کون سا اللہ میاں کے پچھواڑے کا مقام ہے جس کے نام میں نہ نگر آتا ہے نہ پُور کہ پتہ چلے کن لوگوں نے بستی بسائی ہے، بس ادھ کٹا سا نام ہے کراچی کراچی۔" پہلے پہل تو وہ دونوں لڑکیوں کی بے پردگی پر خوب چیخیں چلائیں، روئیں پیٹیں، اپنا منہ کھسوٹ ڈالا، سات پشتوں کو کوسنے دیئے، لیکن جب سے ان کی بہو نے اپنا برقعہ نوچ پھینکا اور اپنے ملنے والیوں کی طرح بتی سا دوپٹہ گلے میں ڈال کر پھرنا شروع کیا، تو دادی بی سے کچھ نہ بولا گیا۔ البتہ ان نیک بیبیوں کو ضرور یاد کر لیا کرتیں جن کا پرچھاواں بھی کسی غیر مرد نے دیکھا ہوگا، جو اپنے لمبے لمبے فرشی غراروں کے ساتھ پرانے زمانے کی سیلی ہوئی بدبو، جو پرانے مقبروں میں آتی ہے، بن کر ختم ہو گئیں اور اپنے جھمکے ٹیکے، پہنچیاں، چوسے دنتیاں اس دنیا میں چھوڑ گئیں جن کو تڑوا کر دادی بی نے بیٹے کی شادی پر بڑے ارمانوں سے بہو کو چڑھایا۔ دادی بی کی رہی سہی قوتِ مدافعت اس وقت ختم ہو گئی جب ان کو جاڑا چڑھ کے بخار آیا اور ان کے اس بیماری کی حالت میں بھی نقاہت زدہ پتلی آواز میں "حکیم حکیم" کہنے کے باوجود ان کے اکلوتے فرزند خلیل میاں ڈاکٹر کو بلا لائے جس نے

آتے ہی ان سے کہا "اماں جی زبان نکال کر دکھائیں" یعنی حد ہو گئی کہ غیر مرد دوا ایک پردے دار سیدانی سے کہہ رہا ہے کہ زبان نکال کر دکھاؤ، جس کی ایڑی تک کسی مرد نے نہ دیکھی تھی، جو ممیوں تک سے پردہ کرتی تھی، وہ اپنی زبان نکالے، توبہ استغفار! اور جس نے ان کی نبض ٹٹولی سینے پر (توبہ توبہ سینے پر!) آلہ رکھا۔ ذرا جان میں جان آئی تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ ذرا سی دکھ بیماری کے پیچھے اپنا ایمان خراب نہیں کروا سکتیں۔ "بھاڑ میں جائے ایسا علاج اور چولہے میں جائے ایسا معالجہ۔ نہ میاں ہیں نہ ایسے ڈاکٹر پاکڑ سے دو بدو کرتی۔" انہیں سندیلے کے حکیم جی یاد آئے جو پردے دار مریضہ کی نبض سے دھاگہ چھوا کر منگوا لیتے اور دھاگہ سونگھ کر مرض کی تشخیص کر دیتے تھے کہ جگر میں گرمی چڑھی ہے یا معدے پر بادی کا اثر ہے، اور شفا ہاتھ میں ایسی کہ اِدھر انہوں نے خمیرۂ فلاں چٹا کر حبِّ ڈھکاں کھلائی اُدھر مریض لوٹ پیٹ کر بھلا چنگا۔ مگر جب ایک دفعہ ڈاکٹر دادی بی کو دیکھ گیا تو پھر کیا تھا۔ کیا خبر نگوڑی دوا میں شراب ملی ہو۔ وہ اسے اپنی ذلت سمجھ کر روئیں دھوئیں، چندیا کے ڈھائی مٹھی بال نوچے مگر خلیل نے اُنہیں یہ کہہ کر قائل کر دیا کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا اور جو کیا ہے وہ آپ کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ گھر میں ڈاکٹر کا آنا، جوان جہاں بچیوں کا بے پردہ پھرنا اور ایسی بہت سی باتوں کو جو اُنہیں پہلے پہل بہت چکراتی تھیں، انہوں نے نہ ملنے کا ڈھنگ سمجھ کر برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ حتیٰ کہ بے پردگی کو بھی "جیسا دیس ویسا بھیس" کہہ کر اپنے آپ کو

تسلی دے لی تھی اور اٹھتے بیٹھتے دہرانے لگی تھیں کہ "یہاں یہی دستور ہے تو ہم کیا کریں۔ ہاں میاں چودھویں صدی ہے جو نہ ہو سو تھوڑا ہے۔"

بہت سے لوگوں کی طرح دادی بی کے لئے سندیلے سے کراچی کا سفر چودھویں صدی سے بیسویں صدی میں آنا تھا۔ یہ بات میں استعارتاً نہیں بلکہ واقعتاً کہہ رہا ہوں، سندیلے میں وہ ہجری سن کے حساب سے چلتی تھیں البتہ مہینوں کے نام خالص دیسی استعمال کرتی تھیں۔ خالی، تیرہ تیزی، مدار، میراں جی، خواجہ معینؒ اور بارہ وفات وغیرہ، اور کراچی میں اگر چودھویں صدی ہجری کے بجائے بیسویں صدی عیسوی مستعمل ہوگیا۔ مہینوں کے نام جنوری. فروری مارچ اپریل ہونے لگے۔ "اس موئی مُردی بانٹ کھونٹ نے کہیں کا نہ کھنا" انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کو، جو میرٹھ میں رہتی تھیں، خط میں لکھوایا "جڑ سے اکھڑے پودے کی طرح آتے جاتے جھونکے کے ساتھ اُڑے اڑے مارے کھنڈیرے پھرتے ہیں"۔ ان تمام تبدیلیوں کا ان کے گھرانے پر بھی خوب اثر پڑا۔ بیٹھک کو ڈرائنگ روم کہا جانے لگا اور اس میں دری چاندنی تکیے کی جگہ کشن دار صوفے آگئے، چارپائیوں کی جگہ ڈبل بیڈ نے لے لی، کھانے کی وہ میز جس پر سندیلے میں گھر کا سارا اٹرم سٹرم (مثلاً پٹاری، طوطے کا پنجرہ، دھوبی کی دھلائی، توشکیں، لحاف، رضائیاں وغیرہ) رکھا جاتا تھا اور جو صرف بہت تکلف کے مہمانوں کی آمد پر برتی

Scanned with CamScanner

جاتی تھی، باقاعدہ استعمال میں آنے لگی، کھانا بجائے چارپائی پر بیٹھ کر اور سالن سے لبالب بھری رکابیاں دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر بیٹھنے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھ کر کھایا جانے لگا؛ بچا ہوا کھانا پھینکنے کے بجائے ریفریجریٹر میں رکھا جانے لگا؛ ناشتے میں انڈے پراٹھے کی جگہ ڈبل روٹی نے لے لی جو سندیلے میں صرف اس وقت کھائی جاتی تھی جب کوئی اتنا بیمار ہوتا کہ روٹی نہ چبا سکتا اور جس سے دادی بی کو وہ وقت یاد آجاتا جب خلیل کو میعادی بخار ہوا تھا اور وہ دونوں وقت ڈبل روٹی کے توس دودھ میں چوا کر انہیں چمچوں سے کھلاتی تھیں؛ خلیل نے قمیص پاجامے پہن کر گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا اور علی گڑھ مارکہ کالی شیروانی کے بجائے نیلون بشرٹ پہننے لگے؛ بہو بیگم نے تنگ پاجامے اور غرارے پرانے کپڑوں کے بکس میں ڈلوا کر درزی سے شلواریں سلوا لیں۔ دنیا بدل گئی۔ مونڈھے اور پیڑھی کی جگہ صوفے آ گئے اور بچے نیم کی ڈنڈی سے مسواک کرنے کے بجائے ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کرنے لگے جو دادی بی کو گیلا آٹا معلوم ہوتا؛ لڑکیوں کے نام شوکت آرا اور محمودی کی جگہ نیلوفر اور صنوبر اور رخسانہ ہونے لگے، لڑکے اجنّ اور تننّ کے بجائے ٹونی اور جیکی کہلانے لگے جسے سن کر دادی بی کو ایسا لگتا کہ کوئی کتے کو چمکار رہا ہو، کیونکہ ٹونی اس ڈفیل کتے کا نام تھا جو دادا مرحوم کو ان کے ایک انگریز دوست نے ولایت جاتے ہوئے تحفے میں دیا تھا اور جس کی

Scanned with CamScanner

بھونک سن کر دادی بی جھٹ ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کاڑھ لیتی تھیں۔
دادی بی کو سندیلے کا مکان بہت یاد آتا تھا کیونکہ کراچی کی کوٹھی میں گھاس کا قطعہ تو تھا، جسے خلیل میاں نہایت چاؤ سے لان کہنے پر اصرار کرتے، مگر نہ آنگن تھا نہ صحن، برآمدے تو تھے مگر نہ دالان نہ انگنائی اور سب سے بڑھ کر کھڈیوں کی جگہ انگریزی فلش تھے جن پر بیٹھ کر دادی بی کو ہول اٹھنے لگتے تھے۔ دنوں دادی بی سندیلے کی امی جمی یاد کر کے آہیں بھرا کرتیں۔ اس گھرانے کے ساتھ بھی وہی ہوا جو تقسیم سے متاثر ہونے والے متوسط طبقے کے لاکھوں ہزاروں گھرانوں کے ساتھ ہوا۔ یہ بات نہیں کہ وہ وہاں سندیلے میں نیم وحشیوں کی طرح رہتے تھے اور بیسویں صدی سے باخبر نہ تھے، لیکن ایک تو وہاں کے ماحول میں صدیوں کا ٹھیراؤ اور سکون تھا جس میں کسی نئی چیز یا کسی نئے طریقے کے گھروں میں آتے آتے اور لوگوں کے اسے قبول کرتے کرتے برسوں لگ جاتے کہ زندگی جس ڈھرّے پر چلی جا رہی تھی اسے بڑی سے بڑی ایجاد اور ترقی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکتی تھی؛ نئی سے نئی ایجاد خود ہی اس ماحول کا حصہ بن کر اتنی ہی بوسیدہ اور پرانی ہو جاتی جیسے مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر اور مائکروفون کے استعمال پر پہلے تو مولویوں نے کفر کا فتویٰ داغا مگر رفتہ رفتہ لاؤڈ اسپیکر نے مکبّر کی جگہ لے ہی لی۔
دوسرے یہ کہ پاکستان آکر خلیل میاں کلرک کے بجائے افسر ہو گئے اور ان کے سماجی مرتبے میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔ وہ خلیل بابو کے

بجائے خلیل صاحب کہلانے لگے، دفتر میں ان کے کمرے کے باہر ایس۔ ایم خلیل سپرنٹنڈنٹ کی تختی لگ گئی اور اپنے ان رشتہ داروں سے ملنے میں کترانے لگے جو پرانے کوارٹروں میں آن بسے تھے اور انگریزی نہ بول سکتے تھے۔ دادی بی کو ان تبدیلیوں کا شعور نہ تھا اور وہ برابر ہر نماز کے بعد پل پل کر دعا مانگے جاتیں کہ خلیل میاں کلکٹر ہو جائیں تو وہ بڑے پیر کی نیاز دلوائیں گی۔ ان کی سمجھ میں بار بار کے بتائے جانے کے باوجود یہ بات نہ آ سکی کہ راتوں رات کلکٹر کا عہدہ ہی ختم ہو گیا۔" اے واہ" وہ کہتیں " کلکٹر پورے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے، اس کے سامنے کسی کی کیا مجال کہ چوں کر جائے۔" یہ اور ایسی بہت سی باتیں تھیں جن کو وہ سمجھ نہ پاتیں مگر جن کے ساتھ انہوں نے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا.........اور اب یہ موا جھاڑ و پیٹیا شیطان کا چرخہ!

کئی دن تک بچوں میں اس کا چرچا رہا اور دادی بی کا دل اچھل پھل ہوتا رہا۔ چھوٹا جلیل جب اپنی دونوں بہنوں شکیلہ اور جمیلہ کو بتاتا کہ ٹیلی وژن کیا ہوتا ہے تو دادی بی چپکے زیر لب دعا کرتیں کہ یا اللہ، یا الٰہی اپنے پیارے نبی کے صدقے میں بندی پر آزمائش نہ ڈالیو، یا علی یا ایلیا یا مولا مشکل کشا.........تین چار دن کے بعد بات آئی گئی ہو گئی لیکن دادی بی جانتی تھیں کہ بات ختم نہیں ہوئی ہے، کسی بھی لمحے آزمائش کی گھڑی آ سکتی ہے۔ اندر ہی اندر کھچڑی سی پکتی رہی۔ خلیل میاں، بہو بیگم، جلیل، شکیلہ، جمیلہ اور ننھا جمیل دن میں کئی دفعہ اس کے بارے میں سوچتے۔ دادی بی ایک مرتبہ اس کی مخالفت کر کے خاموش ہو گئیں،

Scanned with CamScanner

اس کے بعد ان سے نہ کسی نے اس کا ذکر چھیڑا نہ انہوں نے خود بات نکالی۔ اصل کرائسس اس وقت آیا جب خان صاحب کے گھر میں ٹیلی وژن سیٹ آگیا اور انہوں نے نہایت فخر سے محلّے بھر کو ٹی وی دکھانے کے لئے اس طرح بلایا جیسے کولمبس نے باری باری اپنے ملاحوں کو دور افق پر وہ نیلی لکیر دکھائی ہوگی جسے وہ ہندوستان کا ساحل سمجھتے تھے۔ اور جو اصل میں امریکہ کی نو دریافت سرزمین تھی..... دادی بی نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ "ائے تم لوگ جاؤ۔ میں تو غارتی پڑے شیطان کے چرخے کی پیشوائی کو نہیں جاتی۔ نہ بابا، میں تو اصل نسل کی سیدانی ہوں، میں نہیں جاتی موئے انگریزوں کے سامنے۔"

"چلو ان سے بحث کرنا بے کار ہے" خلیل میاں بیوی بچّوں کو بٹور کر لے گئے۔ دادی بی شدّتِ غم سے فوراً مصلّیٰ بچھا کر اس پر جا بیٹھیں "یا اللہ تو ہی وارث ہے، پردیس میں لاج رکھیو، یا اللہ اب تو مٹّی عزیز کرلے۔"

گھر والے خان صاحب کے یہاں سے لوٹے تو چھوٹوں کے چھوٹوں ٹی وی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ننھا جمیل جو دادی کا بہت منہ چڑھا تھا، ان کی گود میں چڑھ بیٹھا اور ننھے ننھے موٹے موٹے ہاتھوں سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "دادی بہت بوہوت مجا آیا، پکوڑے بھی کھلائے۔ تم کیوں نہ چلیں؟"

"نہ میرے بچّے۔ میری نماز کا وخت ہوگیا تھا۔"

Scanned with CamScanner

"بوہوت مجا آیا۔ سچی"

"یہ تو بتاؤ کہ دیکھا کیا"

"مجھے کیا معلوم، آپا سے پوچھو" وہ ان کی گود سے مچل کر کود پڑا اور گیند اچھالنے لگا۔

"ائے جمیلہ بیٹی، یہاں تو آنا۔ ہمیں نہیں بتاؤ گی کیا دیکھا؟"

"دادی بس ایک ڈبہ سا ہوتا ہے جس میں بہت سارے کھٹکے اور بٹن ہیں جن سے چلتا ہے۔ بالکل ریڈیو جیسا ہوتا ہے"

"اور انگریز نہیں نکلے اس میں سے؟"

"نہ انگریز نہ انگریز کی دُم۔ اس میں تو بس منوّر نقطے، چمکدار لکیریں، بُندکی دلنے اور لائنیں ہی لائنیں تھیں۔ مجھے تو سوئیٹر کا نمونہ سا لگ رہا تھا۔ جو اون سلائیاں لے گئی ہوتی تو جمیل بھیّا کے پُل اوور کا ڈیزائن ڈال لیتی۔ مگر ابھی لگا نہیں ہے وہ۔ خان صاحب کہہ رہے تھے جب چھ بجے پروگرام آئے گا تب دِکھے گا۔ ہم تو پھر کے سے جائیں دیکھنے کو"

"مَوکھا سا ہوتا ہوگا جس میں سے نکلتے ہوں گے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ موٹا شیشہ لگا ہوتا ہے جس کو اسکرین کہتے ہیں اس میں تصویر ہوتی ہے۔ خان صاحب کہہ رہے تھے کہ ڈنڈا مارنے سے بھی نہیں ٹوٹتی وہ۔ اور ٹی وی کے ایریل کو ایریل نہیں کہتے، اینٹینا کہتے ہیں"

Scanned with CamScanner

"تو پھر وہ شیشے کی نہیں ہوگی، کچھوے کی پیٹھ کی ہوگی۔ وہی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ لاٹھی سے بھی نہیں ٹوٹتی۔"

"اے ہٹو بی۔ کچھوے کی پیٹھ میں کیا خاک تصویر نظر آئے گی۔"

"شیشے میں تصویر آتی ہے؟ میں جانوں فوٹو کھنچتا ہوگا۔ نوج، کم بخت مارے انگریز ہماری بچیوں کے فوٹو کھینچ کھینچ کر ولایت لئے جا رہے ہیں۔ ہو نہ ہو کسی کی بات چیت لگانی ہوگی۔ ولایت کے بادشاہ کے لئے لڑکیاں دیکھی جا رہی ہوں گی۔ ہم نے سنا تھا کہ کوئی طلاقن اس کے گلے پڑ گئی ہے۔ اے واہ یہ بھی خوب ہے کہ کوئی لڑکی دکھائے نہ دکھائے، وہ زبردستی اس کا فوٹو کھینچ لیتے ہیں۔ یہ عجیب رسم چلی ہے پاکستان میں کہ گھر گھر لڑکی دیکھنے چلے آتے ہیں۔ ہم تو نہ بیا ہیں اپنی بھول سی لڑکیوں کو ولایت کے اُجڈوں میں"

"ایسی کون سی ہم ابلا پری ہیں کہ ولایت کا بادشاہ بیاہ لے جائے گا"، دونوں لڑکیوں نے دوپٹوں میں منہ دے دے کر ہنسنا شروع کر دیا۔

"تو پھر ہوگا۔ ہم کیا جانیں۔ نہ ہم نے ایسی چیزیں دیکھیں نہ سنیں، نہ ہمارے زمانے میں ہوئیں۔ نوج جو ایسی بے حیائی ہوتی ہو، یہاں تو جس کو دیکھو اس کا دیدہ ہوائی ہو گیا ہے۔ اب تو لڑکیاں بھی مردوں کو جھانکنے لگی ہیں۔"

"دادی بی آپ کے زمانے میں مردوں کو نہیں دیکھا جاتا تھا؟"

Scanned with CamScanner

"واہ ہم کیوں دیکھتے۔ ہاں تمہارے دادا کے پاس ایک وہ شاعر صاحب آیا کرتے تھے جو ہم چلمن کے پیچھے بیٹھ کر ان کا کلام سنا کرتے تھے۔ مگر تم لوگ تو ایسی اچپل ہوئی ہو، نہ بھیا ہمارے زمانے میں تو ایسا نہ ہوتا تھا ائے ہمارے وہاں سندیلے میں تو ...."

دادی بی کا ٹیپ ریکارڈر چالو ہو گیا تو دونوں لڑکیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے، غائب ہو لیں اور وہ دوپہر کے کھانے تک بولے چلی گئیں۔ کھانے کے وقت آلو کے سالن نے ان کا منہ بند کیا۔

خان صاحب کے ٹیلی وژن کی محلّے بھر میں شہرت ہو گئی جیسے بادلے گاؤں میں اونٹ آگیا ہو۔ خلیل میاں کا گھر ہو یا پرچون والے کلّن کی دوکان، سارے محلّے میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ رہی سہی کسر سگّو جمعدارنی پوری کر دیتی جو سارے گھروں میں اس کی خبروں کے ساتھ پھرتی پھری۔ "خان صیب نے تو جی اس کے لئے نوی ٹیبز بنوائی ہے جی ایڈی وڈی ٹیبز ہے جی۔" محلّے میں رہنے والے کم تر لوگ، جس میں نکڑ کی دوکان والا، بچّوں کو پڑھانے والے حافظ جی، نائی، اخبار والا، کوٹھیوں کے ملازم اور شاگرد پیشہ بھی شامل تھے، کچھ کم متاثر نہ تھے۔ سگّو جمعدارنی سوچنے لگی کہ وہ خان صاحب کے گھر میں کیوں نہ اس وقت کام کرنے آئے جب یہ بولتا ہوا ریڈیو چل رہا ہو تاکہ اسے بھی دیکھنے کو مل جائے اور وہ باقی جمعدارنیوں سے کہہ سکے "ہم نے تو دیکھ بھی لیا جی۔" کلّن سوچنے لگا کہ وہ خان صاحب کے گھر کا سودا ملازم کے ہاتھ بھجوانے کے بجائے آئندہ

Scanned with CamScanner

سے خود لے کر جائے گا اور کوشش کرے گا کہ وہ اس کو جھانک کر دیکھ سکے۔ حافظ جی البتہ ناراض تھے" واللہ صریحاً ناجائز ہے۔ نامحرموں کی صورتیں نظر آئیں گی جو قطعاً غیر مشروع ہے۔ بچیوں کا رلا سہا دین ایمان بھی اُٹھ جائے گا۔ پہلے ہی ریڈیو کی پھٹکار کیا کم ہے جو اوپر سے یہ لعنت اور آگئی۔ گھر گھر، دوکان دوکان ریڈیو رکھے ہوئے ہیں، سودا بیچنے والے سودا بعد میں بیچتے ہیں، کان پر اس کا چونگا پہلے لگائے رکھتے ہیں۔ اخلاق سوز گانے سنے جاتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کسی سے کہ قرآن شریف کی آیتیں دہرائے، نعت شریف گائے۔ لاحول ہے۔ اب یہ اور چیز آگئی جس میں انگریز عورتیں کو دیکھ دیکھ کر سب کے وضو ٹوٹ جائیں گے" حافظ جی کو زور سے آخ تھو کرنی پڑا وہ تو خیر بے چارے نابینا تھے، ان کے لئے ٹی وی کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ خان صاحب کا باورچی جو پچھلے مہینے کہہ رہا تھا کہ اب کی پہلی سے میرا حساب بے باق کر دیں آپ کے یہاں کام زیادہ ہے اور ایک اکیلی میری جان کرنے والی، اس نے جو حافظ جی کی زبانی سنا کہ ٹیلی وژن پر انگریز عورتیں ناچیں گی تو وہ ایسے رک گیا جیسے اس نے کبھی جانے کا نام ہی نہ لیا ہو بلکہ اس نے تو کلن دوکاندار سے کہہ دیا کہ میں تو اب اس گھر میں نوکری کروں گا جس میں یہ بولتا ہوا ریڈیو ہوگا چاہے وہ سو روپے کم تنخواہ دیں یا گدھے کی طرح کام لیں۔ خان صاحب کی بیوی یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر محلے کے بچے اُن کے یہاں ہر وقت ٹی وی دیکھنے کے لئے آنے لگے تو ان کا ڈرائنگ روم تو ستیاناس ہو جائے گا۔ کوئی ایک دن برداشت کرے،

Scanned with CamScanner

دو دن سہار لے مگر یہ تو روز روز کی مصیبت ہو گی۔ پھر انہیں خیال آیا کہ وہ فی بچہ چار آنے وصول کر سکیں گی جیسے وہ محلّے والوں سے ٹیلی فون کی چونّی چارج کر لیتی ہیں۔ اس خیال سے انہیں بہت طمانیت ہوئی۔ گھر بیٹھے کی تفریح اور اوپر سے مفت کی آمدنی الگ اپنے ڈب میں آئے۔ محلّے کے سارے بچّے ٹی وی کے آنے سے بے حد اکسائٹڈ تھے، اتنے کہ شاید اپنے یہاں نئے بھائی بہن کی سالانہ آمد پر بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ ابتدائی اچنبھا کم ہوا تو بچّوں کو احساس ہوا کہ یہ کتنے مزے کی چیز ہے۔ "آہا جی اب تو خوب کھیل تماشے دیکھیں گے، خان صاحب کا چھوٹا لڑکا آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہنے لگا تو باقی بچّوں کے ننھے ننھے دل رشک و حسد سے سُکڑ گئے۔

جمیل جو پانچ سال کا ہونے کے باوجود کبھی کبھی تُتلانے لگتا تھا اور جس کی تتلاہٹ پر خوش ہو کر اس کی ماں منہ چومنے لگتیں اور دادی صدقے واری ہو جاتیں، اپنے ابّا کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیوں بیٹے کیا بات ہے؟" خلیل میاں نے پوچھا کہ جمیل ان کا بھی حد سے سوا لاڈلا تھا۔

"ابّا ابّا ہمیں ٹی وی دلا دو" اُس نے اٹھلا کر کہا۔ خلیل نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا، بس گود میں اٹھا کر اس کی انگلیوں سے اچھیا بچھیا کھیلنے لگے، مگر بڑے بچوں کو اس کا پتہ چل گیا کہ موضوع چھڑ چکا ہے اور اگر وہ بھی کہیں سنیں تو شاید ابّا پسیج جائیں۔ پھر ٹی وی آ جائے تو کتنا مزہ آئے گا! رابن ہڈ کی فلم دیکھنے کے لئے خان صاحب کے یہاں

Scanned with CamScanner

نہیں جانا پڑے گا، اور وہ رابن ہڈ کیسے زن سے تیر چلاتا تھا طے یہ ہوا کہ رات کے کھانے پر بات کی جائے، مگر سوال یہ تھا کہ ابّا سے کہے کون۔ یہ مسئلہ اتنا ہی سنجیدہ تھا کہ جتنا چوہوں کا بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا مسئلہ۔ اس لئے کہ خلیل میاں کو جب غصّہ آجاتا تو وہ ایک سرے سے سارے بچّوں کو دُھننا شروع کر دیتے اور دادی بیچ بچاؤ کرانے آتیں تو ان پر الگ جھلّاتے کہ تمہارے بے جا لاڈ پیار نے انہیں بالکل دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔

"تم کہونا" شکیلہ نے جمیلہ کو کہنی ماری۔ "اوہوں ---- جلیل بھیّا کہیں-----" جمیلہ نے بھائی کی طرف اشارہ کر دیا۔

"کیا بات ہے، تم لوگوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟" خلیل نے تینوں میں سرگوشیاں ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ --- کچھ نہیں ----آپ ٹی وی لائیں گے؟" جلیل نے بہت ہمّت کر کے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہمیں بھی ٹی وی لے لینا چاہیئے،" آمنہ فورًا اپنے بیٹے کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

"ایک کے گھر میں ٹی وی آگیا تو تم لوگ حرص کرنے لگے۔ یہ بہت غلط عادت ہے،" خلیل نے بیوی کو جواب دیا۔

"حرص کی کیا بات ہے۔ ابھی خان صاحب نے لیا ہے، کل پرسوں ثریّا کے میاں بھی لے آئیں گے۔ مسز حمید کہہ رہی تھیں کہ ان کے یہاں

بھی آجائے گا۔۔۔۔"

"تو آنے دو، ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے"

"آخر مجھے بھی تو اپنی ملنے جلنے والیوں میں منہ دکھانا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اتنے بڑے سرکاری افسر ہیں اور ان کے یہاں ابھی تک ٹیلی وژن نہیں آیا۔" تینوں بچوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب معاملہ امی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور وہ ابا سے لڑ لڑ کر اور انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر ہمیشہ کی طرح بات منوالیں گی جیسے پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں مری ایبٹ آباد جانے کی بات انہوں نے منوائی تھی۔

یہی احساس دادی بی کو بھی ہوا کہ اگر بہو بیگم سنجیدہ ہوگئیں تو چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے وہ اپنی بات منوا کے رہیں گی۔

"نہ بہو نہ بچی۔ ایسی چیز کا گھر میں آنا ٹھیک نہیں۔ خدا جانے کون بلا بدتر اس میں سے نکل آئے۔ انگریز کی بنائی ہوئی چیز کا کیا اعتبار، جو فرض کرو اس میں سے گورے لِف رائی لِف رائی کرتے نکل پڑیں۔ تمہارے بھی منہ پر بچے ہیں، جوان جہاں کنواری لڑکیوں کا ساتھ ہے، کل کلاں کوئی اچھی بری بات ہو جائے تو پردیس میں کس کا آسرا دیکھیں گے؟ اور یہاں پر تو شہید مرد بھی نہیں ہوتے کہ جن کے نام پر جمعرات کے جمعرات مٹی کا دیا جلاؤ اور پاؤ بھر امریتوں کی نیاز دلاؤ تو پناہ میں رکھتے ہیں۔ نہ ہوا اپنا سندیلہ ورنہ پیر چھدامی شاہ سے تعویذ لکھوا لیتے پھر کوئی فکر چنتا نہ ہوتی۔"

Scanned with CamScanner

آمنہ بیگم چڑ کر بولیں، کہ وہ دادی بی کی بے ڈھنگی دقیانوسیت سے بالعموم جھلائی ہوئی رہتی تھیں، "حد ہو گئی، ٹیلی وژن ہی تو ہے، کوئی ٹروجن گھوڑا تو ہے نہیں کہ اس میں سے انگریز نکل آئیں۔ مشین کے اندر سے آدمی کیسے نکل سکتا ہے، آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتیں اور آپ کب تک کراچی کو پردیس کہتی رہیں گی؟"

ان کا اس طرح چڑ کر بولنا دادی بی کو ازحد ناگوار ہوا۔ "تمہارا کیا ہے، تم تو فوراً ان سے گٹ پٹ بگھارنے لگو گی۔ گورا پنڈا ہے وہ بھی تمہیں اپنی طرف کی سمجھیں گے، ناک چوٹی تو میری کٹے گی۔ مجھ نگوڑ ماری سے گٹ پٹ بھی نہ ہو سکے گی غیر مردوؤں کے سامنے۔"

اب خلیل میاں کو بولنا پڑا۔ "اوہو، بھئی کیا بک بک جھک جھک ہے۔ کوئی نہیں آتا اداتا ٹیلی وژن۔ سبزی ترکاری سمجھ رکھا ہے کہ گئے اور اٹھا لائے۔ روپیہ کوئی پیڑوں پر اگتا ہے؟ ہزار ڈیڑھ ہزار نقد چاہیئے ہو گا، اور پھر میں اس کے حق میں بھی نہیں۔"

"کیوں ابا" چار چھوٹی بڑی آوازیں دنیا کا سارا یاس اور ناامیدی اپنے اندر سمیٹ کر بولیں۔

"میں نے ریڈرز ڈائجسٹ میں اس کے خلاف ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ بچوں پر اس کے بہت برے اثرات پڑتے ہیں۔ امریکہ میں تو کئی آدمیوں نے ٹیلی وژن دیکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ کچے ذہنوں پر مار دھاڑ اور تشدد کے واقعات کا زہر چڑھ جاتا ہے اور

بچے ایذا پسند بن جاتے ہیں۔"

" ابا وہ آپ جس کا نام لے رہے ہیں، بہت بڑا آدمی ہوتا ہے کیا، سب کو اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔" جمیل نے پوچھا۔

" نہیں بیٹا۔ وہ تو رسالہ ہوتا ہے۔ بڑے مفید اور عملی مضامین ہوتے ہیں اس میں۔ میں تو کسی بھی موضوع پر اپنی رائے اس کے آرٹیکل پڑھ کر ہی قائم کرتا ہوں۔ اس میں لکھا تھا کہ زیادہ ٹی وی دیکھنے سے بچے تنہائی پسند اور اینٹی سوشل بن جاتے ہیں، پھر ان کی فطری تخیلاتی صلاحیتوں پر منفی اثر پڑتا ہے۔"

" چھوڑیئے بھی۔ کہاں دور کی کوڑی لائے ہیں۔ ٹی وی اتنا بُرا ہوتا ہے تو امریکہ والے توپ دم کرا دیتے اس کو۔" آمنہ تنک کر بولی۔

" تم نہ مانو تو بات دوسری ہے۔ تم تو ہو ناسمجھ۔ اس سے ایکس رے نکلتی ہیں، ریڈی ایشن ہوتا ہے۔ ذرا ان سینک سلائی بچوں کو دیکھو، یہ سہارا لیں گے؟ سارے وقت ٹی وی میں دھنت بیٹھے رہیں گے، گھومنا پھرنا چھوٹ جائے گا، دو کوڑی کی تندرستیاں ہو جائیں گی ٹی وی کے سامنے دھرے رہیں گے تو دیدے پٹم ہو جائیں گے، اتی اتی سی عمروں میں عینکیں چڑھ جائیں گی۔"

" برابر والوں کے یہاں بھی آرہا ہے ٹی وی۔ سارے محلے میں ہوں گے ٹی وی سیٹ اور ایک نہیں ہوگا تو ہمارے یہاں۔ بچوں میں کمپلکس

Scanned with CamScanner

پیدا ہو جائے گا۔"

"ٹی وی آجائے گا تو اور برائیاں سیکھیں گے۔ اس دن تم زبردستی ضد کر کے جمیل کو فلم میں ساتھ لے گئیں اور وہ واپسی پر پوچھ رہا تھا کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ یہی سب سیکھیں گے تو آوارہ گردی سیکھیں گے، اخلاق بگڑ جائیں گے۔"

"ابو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ساری نمازیں پڑھیں گے۔ فجر کے وقت دادی کے ساتھ جاگ جایا کریں گے، ایک ایک سیپارہ روز پڑھیں گے اور اخلاق کو بھی نہیں بگڑنے دیں گے،" چار چھوٹی بڑی آوازوں میں اب دنیا بھر کی ساری مسکینی سمٹ آئی۔

"کوئی ٹی وی ای وی نہیں آئے گا۔ بس بہت ہو چکا اس کا تذکرہ۔ اب نہ میں سنوں،" خلیل میاں نے اپنے روایتی غصے سے گرج کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولے "پڑھائی لکھائی کا کچھ ہوش نہیں ہے۔ کیوں جمیلہ تم نے دعائے قنوت یاد کر کے سنائی مجھے؟ اور جلیل صاحب آپ کو کل چودہ اور پندرہ کے پہاڑے سنانے تھے، ہو گئے یاد؟"

چاروں کے منہ لٹک گئے اور وہ جلدی جلدی کھانا ختم کر کے اُٹھ گئے۔ انہوں نے تو آپس میں طے کر رکھا تھا کہ خان صاحب کے یہاں اُنتیس انچ کا ٹی وی سیٹ ہے اس لئے ہم تئیس انچ کا سیٹ لیں گے اور ادھر ابا نے پتہ ہی کاٹ دیا۔ وہ شدید مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے اور ان کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ حد

Scanned with CamScanner

تو یہ ہے کہ شکیلہ اور جمیلہ نے ریڈیو پر فلمی فرمائشی گانوں کا پروگرام تک نہ سنا اور نہ ہی جمیل نے اپنے بڑے بھائی سے اس عجیب و غریب خود ساختہ کھیل کے لئے کہا جس کا نام انہوں نے "چپل ٹینس" رکھا تھا اور جو برآمدے میں ٹینس کی گیند کو چپل سے پیٹے دینے پر مشتمل تھا۔

دادی بی عشار کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ کر تسبیح لپیٹ کر رکھ رہی تھیں۔ "ائے کیوں تم لوگ کھنسائے بیٹھے ہو؟ جاؤ ہنسو کھیلو"، وہ نماز پڑھنے کے بعد ہمیشہ چاروں پہ کوئی دعا پڑھ کر پھونکتی تھیں۔

"ابو نے جو کہہ دیا کہ ٹی وی نہیں لینے کے"، جلیل نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"چلو اچھا ہوا سر سے بلا ٹلی۔ نہیں تو سب کی بے پردگی ہوتی"

"بے پردگی کیسی؟" جلیل نے پوچھا کہ دادی بی نے ٹی وی کے سلسلے میں جو اتنی ہائے توبہ مچا رکھی تھی، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"دیکھو بیٹا۔ یہ نہ بھولو کہ تم بہنوں کے بھائی ہو۔ بیٹا بڑی بھاری ذمہ داری ہوتی ہے بہنوں کے بھائی کی۔ تمہی ان کے بیرن ہو۔ کوئی اگر ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے تو اس کی آنکھیں نکال دو اور کوئی انہیں برا کلمہ کہے تو اس کی زبان کھینچ لو"، جلیل کو اس پر وہ دن یاد آگیا جب نویں جماعت کے ایک لڑکے نے اسکول میں سانولی

جمیلہ کو کالی کلوٹی بینگن لوٹی کہہ دیا تھا اور جلیل نے آدھی چھٹی کے دوران اس کو چیلنج دیا تھا کہ تو نے میری بہن کی بے عزتی کی ہے اس لئے مار کھانے کو تیار رہو جا، اور جب خود پٹ پٹا کر، قمیص پھٹوا کر، ماتھے سے خون بہتا ہوا لے کر گھر پہنچا تھا تو امی سے کہنا پڑا تھا کہ سڑک پر پیر رپٹ گیا اور گر پڑا جس سے پتھر ماتھے میں گھس گئے۔

"کیوں دادی وہاں سندیلے میں آپ سیر تماشے کو جاتی تھیں؟" شکیلہ نے اچانک پوچھا۔

"اے بی سندیلے کا کیا پوچھتی ہو۔ وہاں والوں نے مسلم لیگ کے لئے گلے پھاڑ پھاڑ کر اتنے اتنے نعرے لگائے، تمہارے ابا گھروں گھروں پھرتے پھرے اور ان لوگوں سے اتنا نہ ہوا کہ ایک ذرا سا سندیلہ اُناؤ کا علاقہ پاکستان میں جوڑ لیتے۔ ائے سندیلے کے لڈو کے لئے ایسا میرا جی کرتا ہے۔ کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سندیلے والے سندیلے کے لڈو کو ترسیں گے۔ جو پتہ ہوتا تو میں روز منگا کے کھاتی۔ ایسے عمدہ ہوتے تھے، روپے کے بیس، ادھر منہ میں رکھا اور گھل کے ختم۔ کیسا جی خوش ہوتا تھا۔ سارے میں سندیلے کے لڈوؤں کی دھوم تھی، دور دور سے لوگ شہرہ سن کر آتے تھے، سیروں کے حساب سے لے جاتے تھے، اور اب ہم ہیں کہ برسیں ہو گئیں سندیلے کا لڈو کھائے ہوئے۔۔۔۔"

سندیلے کا نام آیا اور دادی بی کی ریل گاڑی چھٹی۔ شکیلہ نے

Scanned with CamScanner

ان کی بات کاٹ کر کہا " لڈو کا نہیں پوچھ رہی، سیر تماشے کا پوچھ رہی ہوں "

" سیر تماشے ؟ اللہ بخشے تمہارے دادا کا غصہ بڑا خراب تھا، بالکل تمہارے باپ کی طرح۔ سب میں مشہور تھا کہ ان کا غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ خلیل کو مارنے آتے تھے تو مارتے مارتے نیلا کر دیتے تھے۔ ان کا حکم نہیں تھا اس لئے ہم ان کے ڈر کے مارے کہیں نکلتے ہی نہیں تھے، اور نہ وہاں یہ پاکستان کا سا دستور تھا کہ لڑکیاں بالیاں کھلے بندوں بھٹ بھٹ کرتی چلی جا رہی ہیں۔ کہیں جانا ہوتا تو ڈیوڑھی میں کہار آتے تھے ڈولی لے کر، ایک ملازم پردہ تان کر کھڑا ہوتا تو بیٹھتے تھے اور یہ اجازت نہیں تھی کہ کہار سے بھی کچھ کہہ لیں۔ کہاروں کو بتا دیا جاتا کہ فلاں جگہ جانا ہے، وہ ڈولی رکھ کر الگ ہٹ جاتے تب ہم اترتے تھے۔ لکھنؤ میں تانگے پر بیٹھتے تھے تو پہلے دو چھوکرے اس میں چادر لگا دیتے تھے۔ بارہ برس کے لڑکے سے بھی پردہ ہوتا تھا۔ ہولی دیوالی پر رونق دیکھنے جاتے تھے یا رام لیلا ہوتی تھی تو چادر لگا دی جاتی تھی، اس کے پیچھے سے ہم کھڑے ہو کر دیکھتے تھے۔"

" اچھا دادی آپ نے کوئی فلم دیکھی ہے ؟"

" تمہارے دادا تو کیا لے جاتے۔ ہاں جب میری میرٹھ والی بہن لکھنؤ میں رہتی تھیں محلہ سبحان نگر میں، اور میں ان کے یہاں جاتی

تھی تو وہ کبھی کبھار زبردستی لے جایا کرتی تھیں۔ ائے انہیں سیر سپاٹے ہی کا شوق تھا۔ برقعہ سر پر ڈالا، بچوں کو ٹینگے پر چڑھایا، گھر میں تالا ٹھونکا اور کبھی تعزیئے دیکھنے جا پہنچیں، کبھی دیوالی کے دیئے دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ساری عمر یہی کیا۔ اچھے سے اچھا کھایا پیا اور اُڑایا۔ میاں کی ساری تنخواہ ڈکار گئیں یا گھومنے گھامنے میں پھونک دی، یہ نہ ہوا کہ برے وقت کے لئے رکھ لیں کہ ضرورت ہو تو میرا تیرا منہ نہ دیکھنا پڑے۔"

"اچھا تو ان کے ساتھ پکچر دیکھی؟"

"ائے دیکھو ایک تو وہ دیکھی خدا تمہارا بھلا کرے کیا نام تھا اس کا، ہاں "پکار" دیکھی تھی۔ وہ کون کام کرے تھی اس میں، جنیں کیا نام تھا، سونے جیسی رنگت اور یہ بڑی بڑی جگر جگر کرتی ہیرے کی کنی جیسی آنکھیں اور کیسی کوئل کی طرح کوکتی ہوئی آتی تھی۔ اور ایک وہ کھیل دیکھا تھا 'رتن' کیسی بھولی صورت تھی مالن کی جو بڈھے کے پلّے بندھ گئی تھی۔ رتن تو تمہارے دادا کے سنگ دیکھی تھی۔ ایک ان کا جاننے والا شہروں شہروں سلیما دکھاتا پھرتا تھا۔ سندیلے میں سلیما گھر تو نہیں تھا، یہی گھومنے والے آتے تھے جو قنات شامیانہ لگا کر کھیل دکھاتے تھے۔ تو وہ ان کا دوست سندیلے آیا تو انہوں نے ایک وخت کے سارے ٹکٹ خرید لئے تھے اور گھر کی ساری عورتوں کو بھر کر لے گئے تھے۔ تمہارے دادا نے بس وہی ایک کھیل دکھایا تھا کہنے لگے کہ تم سلیما میں بیٹھ کر چھکوں پہکوں روتی ہو، آئندہ سے

میری توبہ جو کبھی تمہیں دکھانے لاؤں۔ اے بھلا وہ سلیمے والی نظروں کے سامنے رنجھ رنجھ کر مر رہی ہو اور وہ اس کا ہوتا سوتا گا گا کر کہہ رہا ہو کہ " جا میں ناہیں تیرا بالموا " تو ہم روئیں بھی نا ؟"

"بس یہی دیکھیں ؟"

" پھر تمہارے دادا نے وہ بھونپو والا گراموفون لا دیا تھا، اس میں توے جیسے گول گول رکاٹ بجتے تھے وہ بجاتے تھے ہم۔ زہرہ بائی انبالے والی، کانن بالا اور خورشید کے رکاٹ تھے، اور وہ تھے محمد حسین ساکن نگینہ کے رکاٹ "دھوئیں کی گاڑی اڑائے لئے جا، اور 'پی بی مینڈکی ری' اور وہ مس دلاری کا رکاٹ تھا 'یا الٰہی مٹ نہ جائے یہ دردِ دل۔ مٹنے والوں کو مٹائے یہ دردِ دل' کیا سُریلی آوازیں تھیں۔"

"سنیما دیکھنے سے بے پردگی نہیں ہوتی ؟" شکیلہ نے بھولی بن کر پوچھا۔

"اے واہ، سلیما تو سمجھ لو کٹھ پتلیوں کا سا تماشہ ہے۔ چلت پھرت کی تصویریں ہوتی ہیں، ان سے کیا پردہ بے پردہ۔ ایسا وہاں سندیلے میں ایک تماشہ دکھانے والا آتا تھا جس کو 'شہر گردینہ' کہتے تھے، اس میں آنکھ لگا دو تو وہ دستی گھما کر تصویریں پلٹتا رہتا تھا۔ ادھنے میں تماشہ دکھاتا تھا اور آوازیں لگاتا جاتا تھا 'نومن کی دھوبن دیکھ، جھانسی کی رانی دیکھ، انوکھا بالک دیکھ' تو وہ بھی

ہم دیکھتے تھے مگر اس سے کوئی بے پردگی تھوڑی ہوتی ہے۔"

"دادی یہ جو ٹی وی ہوتا ہے نا، یہ گھر کا سنیما ہوتا ہے کہ پردے دار بی بیاں گھر بیٹھے دیکھ لیں۔ اس میں سے انگریز نہیں نکلتے۔"

"انگریز نہیں نکلتے؟ لڑکیوں کے فوٹو بھی نہیں کھینچتے؟"

"فوٹو نہ اولوٹ۔ تصویر خاک فوٹو کھینچے گی۔" شکیلہ نے کہا اور یہ دیکھ کر مسکرائی کہ دادی پر اس کی بات کا پورا پورا اثر ہوا ہے۔

"دیکھیں ناں دادی، ہم کتنے بور ہو رہے ہیں ٹی وی کے بغیر"، جلیل نے کہا۔

"جبھی تم لوگ اتنے چپ چپ ہو۔ میں کہوں جنیں کیا ہو گیا۔ دور بلا، جو تمہارے دشمن رنج کریں۔ ہیئے ہیئے کہیں تمہیں وہ نہ ہو جائے جو بہو بیگم انگریزی میں کہہ رہی تھیں، اللہ بچائے ان انگریزی بیماریوں سے، آن کی آن میں چٹ پٹ کر دیتی ہیں۔۔۔"

"کمپلکس"، شکیلہ نے لقمہ دیا۔

"ائے ہاں وہی۔ صدقے واری کر کے پھینک دوں اپنے بچوں پر سے، اے جلیل اے جلو اپنا ماتھا تو چھواؤ۔ دشمنوں کو صدمے سے بخار نہ چڑھ آیا ہو، پنڈا بھی پھیکا پھیکا ہو رہا ہے۔ رات بے رات دل میں اسفل خیالات آتے ہیں۔"

جلیل نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہا "تو آپ کہیں نا ابو سے ٹی وی لانے کے لئے۔"

Scanned with CamScanner

"ائے میں کل ہی کہتی ہوں۔ بچوں سے بڑھ کر ہو گیا انہیں یہ ہوا۔ اور وہ پیسوں کو کہتے ہیں تو میرے کڑے لے لیں، تین تین تولے سے کم کے کیا ہوں گے، بچوں کا صدقہ کروں۔ نہ میری جان تم فکر نہ کرنا، کل ہی بہو بیگم سے کہتی ہوں وہی خلیل میاں کی فاختہ اڑائیں گی تو صاحب زادے کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔ چار حرف کیا انگریزی کے پڑھ لئے، لگے بڑانے۔ الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگے تو بس منشی فاضل ہو گئے، لگے آسمانوں پر اڑنے نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں سے محبت"

یہ تو ظاہر ہے کہ خلیل میاں ٹی وی لے ہی آئے کہ کون شریف مرد اکٹھی دو خواتین کی یلغار کے سامنے رک سکا ہے، چاہے وہ ریڈرز ڈائجسٹ ہی پڑھ کر فیصلے کیوں نہ کرتا ہو، مگر ٹی وی سے دادی بی کے تعلقات کی کہانی کا خاتمہ کس طرح کیا جائے کہ اس میں تسلسل ہے انجام نہیں۔ اس کا منطقی خاتمہ یا تو اس لمحے ہو گیا جب دادی بی نے پہلی مرتبہ ٹیلی وژن دیکھا اور اس میں سیاہ بر سفید تصویر سے اطمینان (اور تھوڑا سا افسوس) ہوا کہ "اس موئی چیز میں سب اپنی ہی کی طرف کے لوگ ہیں، کوئی لال منہا انگریز نہیں ہے، سب اپنی ہی طرح کے سانولے ہیں، ہاں بی کہتے ہیں سانولے من بھاولے" یا پھر اس کہانی کا خاتمہ (مسلسل خاتمہ) اس وقت ہوتا ہے جب

روزانہ پانچ بجتے ہی دادی بی الماری پر رکھی گھڑی بار بار دیکھے جاتی ہیں اور جلدی جلدی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر، تمباکو والا پان منہ میں رکھ کر اور اگلے چار پانچ گھنٹوں کے لئے بیڑے تیار کرکے اپنے پوتے سے کہتی ہیں " اے نَنّھے ، اے نَنّھے ، چھ بج گئے آج وہ مُوا شیطان کا چرخہ نہیں چلاؤ گے ؟" انہیں اب تک اس کا نام لینا نہیں آیا۔

(۱۹۷۸ء)

دفینہ

"لئے غضب ہو گیا، کچھ سُنا....." باقری بُوا شکن آلود ملگجا برقعہ سر پر بے طرح ڈالے ہوئے کہ وہ پیچھے پیچھے سائے کی طرح گھسٹتا، پیروں سے الجھتا چلا آتا تھا، پیروں سے آدھی نکلی جوتیاں کِھسر کِھسر کھینچتی اس قدر بدحواسی کے عالم میں دروازے پر نمودار ہوئیں کہ باجی اماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا اور اچھی بی کے ہاتھ سے سروتا چھُٹ کر پٹاری کے ڈھکنے پر ٹن سے بول اُٹھا "ائے نکل آیا"۔

چمگادڑ کی طرح پھڑ پھڑاتی، برقعے کو سمیٹتی باقری بُوا دروازے سے داخل ہوئیں۔ برقعہ ہوا سے پھول کر اُڑا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باقری بُوا کے بڑے بڑے پنکھ ہوا کے ساتھ کھُل بند ہو رہے ہیں۔ دور سے چل کر آنے سے ان کا سانس پھول رہا تھا اور سستی انگشتریوں، پتلی پتلی چوڑیوں سے لدے ہاتھ کو سانس کی تیزی سے ہارمونیم کی طرح اوپر نیچے اندر باہر ہوتے ہوئے سینے پر رکھ کر بولیں "دو دگھونٹ پانی"۔ باجی اماں کے اشارے پر مُنّی لوٹی چھیلتے چھیلتے اُٹھی، چھُری اور چھلکے وہیں چھوڑ

دوڑ کر گئی اور مٹکے میں سے کٹورا بھر پانی شپا شپ انڈیل لائی۔ باقری بوا
ڈگڈگا کے ایک ہی سانس میں پورا کٹورا چڑھا گئیں اور سانس اس زور
سے چھوڑتے ہوئے کہ جیسے ریل کا انجن سیٹی دے کر دھواں چھوڑتا ہے،
بولیں "اے جیتی رہو، ہزاری عمر ہوئے، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو،
اماں باوا کو خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔" دعاؤں کا افتتاحی راؤنڈ فائر
کر دینے کے بعد سر سے برقعہ اُتارا اور گٹھڑی کی طرح گول مول کر کے
لٹکا دیا اور اپنا بھاری جُثّہ سنبھال، عزارہ سمیٹ چارپائی پہ دھر گئیں۔
چارپائی کی ادوائن اُن کے بوجھ سے دب کر نیچے کو ہو گئی جس سے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ باقری بوا پیالے کے اندر بیٹھی ہیں۔ باجی اماں اور اچھی بی
اپنے اپنے کام چھوڑ کر ان کی طرف ہمہ تن گوش ہو کر دیکھنے لگیں، مگر باقری بوا
میں یہ بُری عادت ہے کہ دور سے ایسا چلّاتی ہوئی آئیں گی کہ جانو کسی معرکے
کی خبر لائی ہیں اور جب تمام لوگ ان کی بات سننے کے لئے خاموش ہو جائیں
گے تو بات شروع کرنے میں جان بوجھ کر دیر لگائیں گی۔ گھُستے گھُستے
اُشقلہ چھوڑ کر اس کی تفصیل بتانے سے گریز کرتی ہیں، اِدھر اُدھر
کی ہانکے جاتی ہیں تاکہ سُننے والوں میں اشتیاق پیدا ہو اور تجسّس کے مارے
اَدبَدا کر اُن سے پوچھیں "کیا ہوا؟" اور وہ سارے گھر کو اپنی طرف متوجہ
پا کر اپنی اہمیت کے احساس سے سرشار ہو کر نہایت فاتحانہ شان سے
بتائیں ——— "ننھی کے سر کی قسم جو شمّہ برابر جھوٹ ہو، مارتے کا
ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے کہتے کی زبان نہیں رُکتی، نیت کا حال اوپر والا جانے

ہم نے تو کہنے والے سے یہی سُنا...... " باجی اماں اور اچھی بی ان کی بات سُننے کے لئے بے تاب بیٹھی تھیں مگر باقری بوا پُرانے داستان گو کی طرح ان کو سسپنس میں رکھ کر ان کے اضطراب پر تازیانے لگائے جا رہی تھیں۔

" جنیں ان کلموہوں کے دماغ کیوں سڑ گئے ہیں۔ اُس موت پڑے بس والے سے کہہ دیا تھا کہ اے موئے چنٹی کا اسٹاپ آئے تو بتا دیجیو، اوگھنا تو فوراً لے لیا اور بتایا نہیں۔ آگے نکل آئے تو بولا اماں اُتری نہیں اسٹاپ تو پیچھے رہ گیا۔ سر پیٹ لیا میں نے کہ ہائے تجھے ڈھائی گھڑی کی آئے اب کہہ رہا ہے........"

" وہ سمجھا نہیں ہوگا کہ تمہیں تین ہٹی اترنا ہے " اچھی بی نے لقمہ دیا۔

" اے واہ، سمجھا کیوں نہیں ہوگا، مُنڈیا تو فوراً ہلا دی تھی چنٹی کا نام سن کے۔ وہاں سے رکشے والوں کو پکارتے پکارتے گلا بیٹھ گیا۔ مونڈی کاٹا کوئی سُنے ہی نا۔ ایک اجاڑ صورت ملا تو اس نگوڑ مارے نے لے کے اِتی دور اتار دیا۔ کمبخت سے کہا کہ اے بھیا ذرا سا گلی میں موڑ لے، دو قدم پہ گھر ہے۔ جھاڑو پیٹیا ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہنے لگا دو قدم پر ہے تو آپ ہی آپ پیتوں پیتوں چلی جاؤ۔ وہاں سے ہانپتی کانپتی چلی آ رہی ہوں......"

" بیٹھ جاؤ دم لے لو، یہ رکشے والے بھی ایسے ہیں......" باجی اماں بولیں۔

" میں نے بھی موئے کے لتّے لے ڈالے۔ سات پشتیں دُھن کے رکھ دیں۔ وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ کمینے اپنی اماں کو پیتوں پیتوں چلا،

Scanned with CamScanner

اپنی بہنا کو بیتوں بیتوں چلا ، اپنی جُرواکو بیتوں بیتوں چلا ------ دماغ چوٹتے رکشہ کھینچنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ذرا گلی میں مُڑنے میّا مرتی ہے۔"

"تم ناحق چیخ چلا کر اپنا جی ہلکان کرتی ہو" باجی اماں نے اُنہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"لو بیوی تم اور اُلٹا مجھی کو اُلہنا دینے لگیں۔ یہاں تو نیکی کے دم میں گھسٹ گھسٹ کے تمہارے گھر تک آئی کہ تمہیں خبر ہو جائے۔ تم مزے سے گھر میں جم جم بیٹھو ، دیکھو میری نگوڑی ٹانگیں کیسی سوج گئی ہیں" باقری بوا نے جوتی اُتار ، پنڈلی اوپر اُٹھا کے اس پر سے غرارہ ہٹایا۔ ٹانگ میں آگے کی طرف پنڈلی کی پوری لمبان میں گھٹنے سے لے کر ٹخنے تک ہڈی کے اوپر پلپلا گوشت فالتو بوٹیوں کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ سُوجَن نام کو نہ تھی۔ "میں نے جس گھڑی یہ خبر سنی بے قرار ہو کر تمہیں بتلانے دوڑی آئی اور تم حق ناحق مجھی کو لڑاکا بتاتی ہو۔ ایسی کون سی میں کنکا لا ہوں ...."

"تم تو دم بھر میں روٹھ جاتی ہو۔ یہ مطلب تھوڑی تھا...." باجی اماں نے صفائی پیش کی۔

"اے بس رہنے دو تم اپنا مطلب وطلب۔ آج جو ننھی کے ابا زندہ ہوتے تو مجال تھی کسی کی جو میری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا۔ بے وارث جان کر سبھی دھتا بتاتے ہیں۔"

اس سے قبل کہ باقری بوا کا منہ سوج کر سوا سیر کا باٹ ہو جائے، باجی اماں نے مُنّی سے شربت بنا لانے کو کہہ دیا۔ مُنّی لوکی میں چھری گھونپ اور اس کو سینی میں پٹخ ، ہوا ہو گئی۔ شربت کی مٹھاس سے ہونٹ چپکے تو بوا کے مزاج کی گرمی مندمل ہوئی۔ باجی اماں نے ان کے بکھرے کو دوبارہ پُرانی حالت پر واپس آتے دیکھ کر جان لیا کہ خطرہ ٹل گیا تو بات چھیڑی۔ "کہو کیا اطلاع لائیں؟"

"اطلاع وطلاع کیا لاتی۔ بتن کے وہاں سے آ رہی ہوں۔" بوا نے بہت رازداری سے سرگوشی کی۔

"بتن کی دُلہن واپس آ گئیں؟"

"اے ان کا کیا ہے۔ واپس نہ آتیں تو اور کیا وہیں چھاؤنی چھا دیتیں۔ میکے والوں نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا ہو گا کہ صاحب زادی کس حال میں ہو۔ یوں تو بڑا مان ہے ان کو کہ میرا میکہ ایسا اور ویسا، دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں۔ اصل میں کیا ہے کوئی ہم سے پوچھے۔ کفن کو کوڑی نہیں اور اس پر زمیندار بنے پھرتے ہیں۔ بارہ بنکی کے نرے گنوار ہیں۔ وہ تو کہو کہ ان کا میکہ انڈیا میں ہے اس لئے بھرم رہ جاتا ہے، جو کوئی یہیں کہیں ہوتا تو پھر ہم بھی دیکھتے۔"

باجی اماں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر یہ قصّہ چھڑ گیا تو شیطان کی آنت ہو جائے گا۔ دُوسروں کی بُرائیاں نکالنے میں بُوا ایسی ماہر تھیں کہ ابھی ایک کی پول کھول رہی ہے اور ابھی ابھی میں بہتی

Scanned with CamScanner

بہاتی خاندان کے دوسرے سرے پر پہنچ کر وہاں کے بخیے اُدھیڑنے لگیں۔
"ہوا کیا ان کو" باجی اماں نے پوچھا۔
"ائے ہونا کیا تھا۔ مری ہوئی لڑکی ہوئی۔ وہ وہ حالتیں خراب ہوئی ہیں کہ پوچھو مت۔ جنیں کے مہینے اسپتال میں رہ کر موت کے منہ سے جاتی جواتی سلامت نکل آئیں۔ میں نے تو اسی وقت کہہ دیا کہ ائے اپنے اچھے ہونے کا صدقہ دو"
"بس یہی بتانے آئی تھیں؟ یہی ہوا؟" اچھی بی کو مایوسی ہونے لگی۔ وہ اتنی دیر سے سمجھے بیٹھی تھیں کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔
"ہئے ہئے بیوی ہونا ہوانا کیا ہے"، باقری بوا نے ٹھنڈی سانس بھری "جیسا ان کا میکہ ویسی وہ خود۔ سدا کی نفقتی۔ صدقے کے نام پر دھیلا نہیں دیا۔ ان کے دل سے کبھی سوئی برابر چیز نہیں نکلی۔ اب دیکھو منوا کی سنجلی لونڈیا کے کن چھیدن ہوئے تو موئی آدھ سیر سڑی بسی جنیں کب کی رکھی چکھی باسی تباسی خرمیاں جھلاتی ہوئی چلی آرہی ہیں۔ میں نے منہ پر نہیں رکھیں کہ ہٹاؤ کس کام کی۔ فوراً کے فوراً مہترانی کو دے ڈالیں کہ لے جا اپنے بچے کچوں میں بانٹ بونٹ دے ------" بوا نے دُون کی لی۔
"جھاڑو پھیروان کے ذکر پر، کیا پٹن پیٹنے بیٹھ گئیں۔ تم یہ کہو کر بتانے کیا آئی تھیں کہ نکل آیا، کیا نکلا؟" باجی اماں نے سوچا کہ اب مزید صبر کرنا بیکار ہے۔ اچھی بی کے تجسس کو بھی گدگدی ہو رہی تھی۔ ویسے بھی خاندان کی بڑی بہو ہونے کی وجہ سے کنبے ناتے کے اچھے بُرے کی خبر رکھنا،

Scanned with CamScanner

اچھے کی کم اور بُرے کی زیادہ، وہ اپنی ازدواجی ذمہ داریوں کا اہم، بلکہ ماموں میاں کے جنت سدھالنے کے بعد سے اہم ترین جزو سمجھتی تھیں۔

باقری بوا نے دیکھا کہ اب بات کو بڑھاوا دینے سے رنگ پھیکا پڑ جائے گا تو بٹوے میں سے چھالیہ نکال کر پھانکتے ہوئے بولیں "بڑی حویلی میں دفینہ نکلا۔"

"سچ کہو" باجی اماں کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور خوشی کے مارے گلے میں دبا ہوا پان کا بیڑا منہ سے نکل آیا، جس کی پیک انہیں گلنار کر گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جھنجھلا جاتیں مگر اس وقت تو وہ اتنی خوش معلوم معلوم ہو رہی تھیں گویا انہیں دو جہان کی دولت مل گئی ہو۔

"اے لو اب اس عمر میں تم سے جھوٹ بول کر بڈھے چونڈے پر کیا کالک تھپواؤں گی؟"

"نہیں، سچ کہو، تمہیں میرے سر کی قسم۔"

"نہ بابا نہ۔ میں نہیں کھاتی قسم وسم۔ جو اُلٹ جائے تو کیا ہو۔ قسم اُلٹی پڑ جائے تو کھانے والے کو بھسم کر جاتی ہے۔ جبھی کہتے ہیں کہ کڑھائی اُلٹے تو پکوان اور قسم پلٹے تو جان۔ ایک دفعہ محفوظی کی سگی ممیا ساس کی بیٹی ....."

"تمہیں کس نے بتایا دفینے کا؟" باجی اماں کے تو سر پر ایک ہی دُھن سوار ہو گئی تھی۔

"لو بیوی اور سنو۔ میں گھر میں بیٹھنے والی، پردہ کرنے والی، مجھے

کون بتلائے گا۔ ہوتا کون وہی بتن کی دلہن کہہ رہی تھیں"۔ ان کا پردہ بھی ڈھکو سلہ ہے، باجی اماں نے دل میں کہا، پردے نے انہیں پھیری والوں سے سودا چکانے اور رکشہ والوں سے لڑنے سے کبھی نہیں روکا۔

"انہوں نے خود دیکھا یا ایسی کہیں کی سُنی سنائی ہے۔ بتن کی دلہن بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بھی کہتی ہیں۔" اچھی بی کو شک تھا۔

"اے بیوی میں کیا جانوں۔ جو انہوں نے کہا وہ میں نے تمہیں بتادیا۔ اب سچ جانو تو اور جھوٹھ جانو تو۔"

"پھر بھی کتنا نکلا؟" باجی اماں تجسس کے مارے آگے سرک آئیں اور گردن نکال کر دیکھنے لگیں جیسے غیر متوقع جواب کو سہہ جانے کے لئے اپنے اندر تناؤ پیدا کر رہی ہوں۔

"ہٹاؤ بھی" اچھی بی نے بیزاری سے ہاتھ چلایا۔ "ہمیں کیا۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔ ہم سے نہ کوئی واسطہ نہ سروکار۔ حویلی جن کی ہوگئی دفینہ خزانہ سب ان کو مبارک۔"

"اے واہ۔ ہم کیوں اپنا دل چھوٹا کریں۔ تمہیں نہ ہوگی قدر اور پھر تم کون سا رہی ہو بڑی حویلی میں۔ تم کیا جانو، تم نے وہ ماحول دیکھا ہی نہیں۔" باجی اماں کو جیسے اتنی اہم خبر سے اچھی بی کی بیزاری کی وجہ معلوم ہوگئی۔

"نہ رہی تو کون سا فرق پڑ گیا۔" اچھی بی لاشعوری طور پر اس تمام ذکر سے اُوب چکی تھیں جو باجی اماں کسی بھی پرانے ملنے والے کے آنے پر

Scanned with CamScanner

لے بیٹھتی تھیں اور گھنٹوں بس یہی بات ہوئے جاتی کہ حکیم جی والی کوٹھی میں جو ڈپٹی صاحب رہتے تھے وہ تمہیں یاد ہیں اور وہ جو کالی میم تھی ڈاکٹرنی ، وہ یاد ہے کہ نہیں۔ گھنٹوں پرانی یادیں تازہ کی جاتیں، بجھی آگ کی راکھ کریدی جاتی۔ ایسے مواقع ماضی میں زندہ رہنے کی بوڑھی عادت کی وجہ سے جلدی جلدی آتے رہتے اور اچھی بی کو محسوس ہوتا کہ انہیں کوئی ایسا کھیل کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے وہ جس کے قُہروں سے بھی واقف نہیں۔

"ائے تم بڑی حویلی میں بیاہ کر آئی ہو تو پاکستان آنے سے پہلے کے برس وہاں رہی ہو ؟" باقری بوا نے پوچھا۔

"ڈیڑھ برس" ، اچھی بی نے بتایا۔ ڈیڑھ برس کے بڑے حصّے میں وہ نئی نویلی دلہن کی حیثیت سے شرماتی رہیں ، اور قبل اس کے کہ وہ اس ماحول میں جذب ہو کر اس کا حِصّہ بن جاتیں ، ملک تقسیم ہو گیا، پاکستان بن گیا ، منجھلے میاں مر گئے ، حویلی چھن گئی اور خاندان ہجرت کر کے پاکستان چلا آیا۔

"آدمی دو گھڑی کو جہاں ٹِک جائے وہیں کی محبت ہو جاتی ہے" باجی اماں نے کہا " اور ہماری تو وہاں زندگی کٹی ہے ، ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ ائے باقری اب بتا بھی چکو کیا نکلا ، تم بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہو۔"

"بتاؤں کیا خاک ، بنّن کی دلہن کو خود معلوم نہیں تھا۔"

Scanned with CamScanner

"اشرفیئیں نکلیں یا سونے کی اینٹیں ؟" باجی اماں کو خاصی بے قراری تھی۔

"ائے شاباش ہے بیوی۔ کہہ تو رہی ہوں کہ مجھ نگوڑی کو نہیں خبر ایک تو گرمی کے مارے دم بولایا جا رہا ہے اوپر سے تم نے دے سوال پہ سوال کر کے ناک میں دم کر دیا۔"

"میں تو جانوں سونے چاندی کی اینٹیں نکلی ہوں گی۔ کیوں باقری؟" باجی اماں کے دل دماغ پہ ایک ہی چیز طاری تھی۔ مگر باقری بوا کو اس وقت سونے چاندی سے زیادہ گرمی ستائے جا رہی تھی۔ اچھی، ذری پنکھیا منگوا دو جھلنے کے لئے۔ کپڑے نگوڑ مارے گرمی کے مارے بدن کھائے ڈالتے ہیں....." ہوا بالکل بند تھی اور حبس سے دم گھٹا جاتا تھا۔ باقری بوا نے دوپٹے کے پلّو سے پسینہ پوچھا اور یکا یک کچھ یاد آیا۔

"ائے تمہیں یاد ہے وہاں حویلی میں گرمی کے دنوں میں کھُرّے بان کی چارپائی پر ٹھنڈا پانی چھڑکوا کر لیٹ رہتے تھے اور اماں جان کہا کرتی تھیں کیسے جنّت کے جھونکے آ رہے ہیں....." ماضی کی اس خنک یاد سے حبس کی گھٹن کم نہ ہوئی۔ پتّے ساکت کھڑے تھے، ہوا کی رمق نہ تھی اور پسینہ ٹپکا پڑ رہا تھا۔ باقری بوا ماضی سے پھر حال میں لوٹ آئیں، مگر ماضی کا جن یادوں کی بوتل میں واپس اتنی آسانی سے نہیں چلا جاتا جب تک اسے کسی ترکیب سے دھوکہ نہ دیا جائے۔ اور باقری بوا بھلا یہ کیسے کر سکتی تھیں۔ پنکھا جھلتے جھلتے وہ پھر بولنے لگیں "لال میاں حویلی

چھوڑ کر دوسرے مکان میں اُٹھ گئے ہیں۔ وہی ساتویں محرّم کو علم اُٹھواتے ہیں اور پیک بنواتے ہیں۔ بتن کی دلہن بتا رہی تھیں کہ بہت بڈھے ہو گئے ہیں، بالکل کٹ گئے ہیں، بھنویں تک سفید ہو گئی ہیں۔"

"اور کیا بتاتی تھیں بتن کی دلہن؟" باجی اماں نے دھیرے سے پوچھا۔ لگتا تھا کہ ان کی آواز گھنے بادلوں کے اندر سے کہیں آ رہی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بخارات کی طرح تھیں جو گاڑھے گاڑھے بادلوں میں تحلیل ہو رہی تھیں اور اس دھواں دھواں ماضی کا بادل ان تینوں کو اپنے اندر لپیٹے ہوئے تھا۔ اچھی بی جلد ہی اس دُھند سے باہر نکل آئیں اور انہیں خیال آیا کہ اس سے پہلے کہ باجی اماں کا تخیّل بدلگام ہو کر وہاں کے گلی کوچوں میں آوارہ بھٹکنے لگے اور وہ وہاں کے بچے بچے سے لے کر کُنجڑے قصائیوں تک کے احوال نام بنام پوچھنا شروع کر دیں، وہ گفتگو کا دوسرا سِرا تھام لیں ورنہ اب اس نہج پر بات چل نکلی تو وہ ناواقفیت کے سبب اجنبیوں کی طرح چُپکی بیٹھی رہ جائیں گی۔ "لال میاں نانا تو ہمارے سامنے ہی حویلی سے الگ ہو گئے تھے؟"

باجی اماں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انہیں کسی اور بات کا خیال آ رہا تھا "جنّیں دفینہ ملا کسے ہو گا؟"

"اللہ جانے تھا کتنا؟" اچھی بی کو خیال آیا۔

باقری بُوا ابھی تک خیال کی اُسی رو کے ساتھ بہہ رہی تھیں "دلہن بتا رہی تھیں کہ حویلی کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ پہلے جہاں دالان تھا وہاں

لڑکیوں کا اسکول کھل گیا ہے اور جن کمروں میں اچھن اور ان کی ماں رہتی تھیں وہ دیوار بیچ کر کے الگ مکان کر دیا ہے۔ ندّو آپا والا حصّہ کھنڈرا گیا ہے اور خالی پڑا ہے۔"

"حویلی میں کون رہتا ہے؟"

"رہے گا کون، وہی ناس پیٹا لالہ بھارت بھوشن ڈٹا بیٹھا ہے۔ وہ کیوں جائے گا، اس کو تو سمجھو سونے کی کان بیٹھے بٹھائے مل گئی۔"

"دیکھنا کمینہ کہیں کا کیسا کم ذاتا نکلا۔ مُوا بِس کی گانٹھ منجھلے میاں کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ میاں میاں کہتے منحوس کی جبّو سوکھتی تھی۔"

"اچھا ایک بات ہے....." باجی اماں بولیں "اُس نے کسی پنڈت گیانی کو بلا کر جاپ کرایا ہوگا جو دفینہ نکل آیا ورنہ اتنی آسانی سے نہیں نکلنے والا تھا۔ ارے ارے دیکھو نگوڑ ماری مرغی سارا کوھتمیر ٹھونگے دیتی ہے، کیاری سے باہر نکالو، ذرا ہُشکاؤ....."

اچھی بی نے وہیں سے جوتی تاک کر ماری جو مرغی کے تو کیا لگتی، دیوار سے ٹکرا کر صحن کے کنارے بنی کیاری میں دھَب سے جا گری۔ مرغی جوتی کے گرنے سے کُڑکُڑا کر مٹکتی ہوئی بھاگ گئی اور صحن کے کچے فرش پر ٹھونگنے لگی جہاں دھول مٹی میں دانہ دُنکا، چاولوں کا بنا دل اور دال کے دانے گرے ہوئے مل جاتے تھے۔ دن بھر مرغیاں صحن میں پڑے پلنگوں اور مونڈھوں پر منڈلایا کرتیں، جن پر بے دُھلے برتن بھانڈے ستائی کے خیال سے اکٹھا خریدے ہوئے آلو، پیاز، گوبھی اور ساگ بد وضع تلوں

اور سینیوں میں ڈھیر رہتے۔ سُتلی کی الگنی پر تو لیے، چھوٹے بھیا کے بدبودار چولہ موزے، بچوں کے دوہر پوتڑے جو پیشاب جذب کرتے کرتے بھوسے کی سی رنگت اختیار کر گئے تھے اور میلی چیکٹ صافیاں جن سے چولھا پونچھنے سے لے کر مرغیوں کی بیٹ صاف کرنے تک کے مختلف النوع کام لئے جاتے تھے، دن بھر لٹکے ہوا کے ساتھ ڈولتے رہتے اور اگر ہوا کا تیز جھونکا چلتا تو مرغیوں پہ گر پڑتے۔ اس حادثے کے بعد مرغیاں خوف زدہ ہو کر چاروں طرف بھدر بھدر بھاگتی پھرتیں اور کپڑا اُن کے ساتھ ساتھ پھرتے پھرتے مٹی اور بیٹوں میں سَن کر دوبارہ دُھلنے کے قابل ہو جاتا۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں بچے اور مرغیاں اسی طرح رُلتے پھرتے۔

"ہیے ہیے حویلی یاد آتی ہے تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے"۔ باجی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیسے چوڑے چوڑے دالان اور صحنچیاں تھیں۔ کنبے کا کنبہ سما جاتا تھا پھر بھی برکت رہتی تھی۔ پوری پوری باراتیں مہینوں ٹھہرا کرتی تھیں۔"

"گئی سو گئی، اب کیا غم، چھوڑو بھی۔ لو اب بتاؤ عمل پڑھوایا تھا انہوں نے یا کوئی اور تدبیر کی تھی؟" اچھی بی کی بیزاری پہ کُرید کا جذبہ غالب آچکا تھا۔

"ہاں یہی کچھ کرایا ہو گا"۔ باقری بوا کا جواب ناکافی تھا۔

"ائے منجھلے میاں نے، خدا انہیں بہشت نصیب کرے، کیسے کیسے

مُلّا عامل بلوائے، سینکڑوں بکرے صدقہ کر دیئے مگر غریب دفینہ نکلنے کی حسرت لئے لئے خود ہی دفینہ بن گئے۔"

"ان کو بڑا ارمان تھا دفینے کا۔ نکل آتا تو سارے دِلدّر دور ہو جاتے، قرضہ بھی سارا ادا ہو جاتا۔ بڑی حویلی کی کھوئی ہوئی عظمت لوٹ آتی۔"

"ائے بیوی قسمت والوں کو دفینہ ملتا ہے۔ منجھلے میاں کی نوانگلیوں میں پدم کا نشان تھا، دسویں میں پدم نہیں تھا چکّر تھا۔ جو اگر دسویں میں بھی پدم ہوتا تو لکھ پتی کروڑ پتی ہوتے۔"

"ہاتھی خانے کے پاس والی جو کوٹھی بیچی تھی اس میں بھی تو دفینہ نکلا تھا۔ جب بعد میں خبر ہوئی تھی تو کیسا افسوس ہوا تھا۔"

"ائے تمہارے منجھلے میاں نے جتنے مکان بیچے سب میں کچھ نہ کچھ نکلا۔ نہ ملا تو اُنہیں کو نہ ملا جو اس کے جائز وارث تھے۔" باقری بوا نے کہا۔ "ان کے نام پر کی دولت گڑی تھی مگر ان کے نصیب کی نہ تھی۔ بے چارے ہاتھ مَلتے دنیا سے گئے۔"

"ائے واہ یہ بھی خوب کہا کہ ہاتھ مَلتے گئے۔ پوتڑوں کے رئیس تھے، انہیں کس چیز کی کمی تھی؟ ہاتھ مَلیں ان کے دشمن۔ سینکڑوں کو خرید کر پھینک دیتے۔ وہ تو کہو کہ بُرا وقت آگیا تھا ورنہ پچاس کوس کے بنیئے مہاجن منجھلے میاں کا نام سن کر بیٹھے سے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔" اچھی بی نے تنک کر جواب دیا۔ باقری بوا پر ان کا مقام واضح

کر دینا ضروری تھا کہ گو آج ان کا بیٹا دوبئی سے ان کو لمبی کمائی بھیج رہا ہے جس کی بدولت وہ یوں حویلی والوں سے برابری کے ساتھ بیٹھی بات کر رہی ہیں مگر ہیں تو اصل میں وہی جو حویلی کی ایک کوٹھڑی میں پڑی بھنکتی رہتی تھیں، میاں کماتے دھماتے نہیں تھے، باجی اماں درپردہ امداد کرتی رہتی تھیں تب تو ان کی گذر اوقات ہوتی تھی۔

اچھی بی نے تائید کے لئے باجی اماں کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی حیثیت کے دفاع میں مدد کریں مگر بڑی حویلی کا نام سن کر باجی اماں جن کے لئے گذرا ہوا وقت موجودہ زندگی سے زیادہ حقیقت رکھتا تھا، گذرے زمانے میں جا نکلی تھیں اور ان کی یادداشت ماضی میں بھٹک رہی تھی۔ "کیوں باقری تمہیں یاد ہے جب صغریٰ آپا کے لڑکے کے یہاں دفینہ نکلا تھا؟"

"کون؟ وہ شبیر؟"

"شبیر نام تھا کہ جنے مُشیر۔ اس کی بیوی نے تین راتوں تک خواب دیکھا۔ روز صبح اُٹھ کر کہے کہ کوٹھڑی کی دیوار تلے کوئی چیز چمکتی ہوئی دِکھتی ہے۔ اس نے میاں سے کہا۔ وہ بھلا کہاں ان باتوں کو ماننے والے۔ علی گڑھ میں پڑھ کے آئے تھے، ہر چیز پر سے ان کا اعتقاد اُٹھ گیا تھا۔ وہ تو بڑے پیر کی نیاز کو بھی نہ مانتے تھے۔ کہنے لگے اونہہ رہنے دو، تم نے رات کو کھانا زیادہ کھا لیا ہوگا، کھانے کے بعد چلا پھرا کرو، دھر کے نہ بیٹھ جایا کرو تو ہاضمہ ٹھیک ہو جائے گا

پھر خواب نہیں دِکھیں گے۔ بھلا بتاؤ وہ ایسی باتیں کرتے تھے۔ اب تیسرے دن اس غریب کو پھر وہی خواب نظر آیا کہ دیوار کے نیچے اتنی بڑی کوئی چیز شکارے مار رہی ہے، جھما جھم جھلا جھل ہو رہی ہے۔ اُس نے پھر میاں سے کہا، انہوں نے پھر ٹال دیا۔ اتفاق سے اس دن اس کی ماں آگئیں۔ اس نے ان سے ذکر کیا کہ اماں ایسے ایسے خواب دِکھا۔ اماں اس کی ایک سیانی۔ کیوں باقری تمہیں تو یاد ہو گا کیسی کُٹنی تھیں۔ ایک دفعہ آپا تو سے کیا لڑی تھیں....." اندھیروں میں ڈوبے ماضی کے پورے پورے وقفے باجی اماں کے سامنے روشن ہو رہے تھے جیسے بند کمرے میں موم بتی لا کر جلا دینے سے وہ تمام چیزیں جن پر بتی کی چھوٹ پڑ رہی ہو، صاف اور واضح ہو جاتی ہیں اور جن پر روشنی سیدھی نہیں پڑ رہی ان کا اندھیرا بھی چمکنے لگتا ہے۔ اس طرح یادداشت کی کمی کو تخیل پورا کر دیتا ہے۔ باجی اماں اندھیرے ماضی کے بند کمرے میں یاد کی جلتی موم بتی لے آئی تھیں اور ان کے سامنے اندھیرے چمک رہے تھے۔

باقری بوا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر باجی اماں دوبارہ چل پڑیں۔ اس کی ماں نے کہا کہ یہ جانو کوئی دھن دولت معلوم پڑتی ہے۔ اب اس نے کیا کام کیا، داماد کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور جھٹ مولوی بُلوا عمل پڑھوانے لگی۔ تین دن روزانہ آ کر مولوی نے عمل پڑھا۔ ریشمی جوڑا اور اکیس روپے نقد لئے۔ مولوی پڑھ پڑھا کر دم کر گئے تو اس نے

سات بکرے صدقے کئے اور ان کا خون دیوار میں چُوایا۔ بکرے اس زمانے میں سستے تھے آج کل کی طرح اندھیر نگری تو تھی نہیں، چار روپے کا ایک بکرا مل جاتا تھا۔ تو سات بکرے کٹوائے، ان کا خون دیوار میں ڈلوایا اور مزدوروں کو لگوا دیوار کھدوا ڈالی۔ اس میں سے پوری دیگ نکلی۔"

"سات بکرے ذبح کروائے!" اچھی بی کو یہ بات دیگ کے نکلنے سے زیادہ تعجب خیز معلوم ہوئی۔ ان کے پاس سے تو بقرعید کے بقرعید ایک بکرے کے پیسے نہیں نکلتے تھے۔

"ائے ہاں بیوی، صدقہ لئے بغیر تھوڑی زمین سے مایا نکلتی ہے۔ پہلے خون چاٹتی ہے پھر باہر آتی ہے۔"

"ان کے تو وارے نیارے ہو گئے ہوں گے۔"

"ائے لو اور کیا۔ پکی کوٹھی بنوالی، ایک مکان اور خرید لیا۔ مار ٹھٹے سے ان کی بیوی آیا کرتی تھیں تقریبوں میں تو بیگم بن کے گاؤ تکیئے سے لگ کر بیٹھ جاتی تھیں، مگر کنجوس ایسی کہ کسی سے کبھی پیسے دو پیسے کا سلوک نہ کیا۔ پاس سے جھنجھی کوڑی نہ نکلتی تھی۔"

"دولت آجانے سے دل تھوڑی بڑھ جاتا ہے۔" اچھی بی نے کہا۔

"میں تو جانوں اور چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ اب یہی، انہی کو دیکھ لو۔ ایک بیٹی کو قائم گنج میں بیاہا تھا، شادی کے بعد وہ مر گئی تو ان سے یہ نہ ہوا کہ اس کے یتیم بچوں کے نام کچھ دے دیتیں۔ سوتیلی ماں نے آکر

وہ ستم توڑے....."

باقری بوا بیچ میں بول اُٹھیں "وہ جو مُنشی رہتے تھے پیپل والی گلی میں، ان کے یہاں بھی تو کچھ نکلا تھا؟"

"پنڈت بشکر ناتھ کو کہہ رہی ہو جن کے لڑکے گوپال اور مدن بھیّا کے ساتھ ہاکی کھیلنے جاتے تھے؟ ان کے یہاں دفینہ نہیں نکلا تھا۔ قسمت دیکھو کہ منجھلے میاں سے مکان خریدا، منجھلے میاں کو دھیلا نہ ملا اور وہ مفت میں مال دار ہو گئے۔ ہائے ہائے نہ منجھلے میاں پر ایسی وقت پڑا ہوتا نہ مکان بیچنا پڑتا نہ ہاتھ سے لکشمی نکلتی۔" باجی اماں ایک مرتبہ پھر افسوس کے گہرے سمندر میں ڈوب گئیں۔

"نکلا کیا تھا وہاں سے؟" باقری بوا نے پوچھا۔

"ہوا یہ کہ پنڈت جی نے مکان میں ایک کمرہ بڑھوایا تھا۔ اس کے لئے نیو کی طرف کھدائی کروائی تو نیو میں سے سونے کی گیّا نکلی۔ سارے میں دھوم مچ گئی کہ پنڈت جی کے گھر سونے کا بچھڑا نکلا، سونے کا بچھڑا نکلا۔ فوراً تھانے کے سپاہی چھان بین کے لئے آ گئے۔ پنڈت ایک عیّار، صاف ہضم کر گئے۔ کہہ دیا گئو ماتا کی ہڈیاں نکلی ہیں جو ملیچھ مسلمانوں نے داب رکھی تھیں۔"

اچھی بی نے پوچھا "کسی نے دیکھا بھی تھا یا یونہی مشہور ہو گئی؟"

"لو وہ پنڈت ایک ایک کو دکھانے بیٹھے ہیں کہ دیکھ لو ہمارے یہاں سونے کی گائے نکلی۔ وہ تو ایسے چُپ ہوئے کہ کچھ نہ پوچھو۔ بیچ

Scanned with CamScanner

کھوج کے کھا گئے ہوں گے۔ وہاں سے بھی چلے گئے۔ مکان پھر کریم الدین درزی نے خرید لیا جب اس کی لاٹری نکلی تھی۔ پنڈت تو سب بیچ باچ بنارس چلے گئے۔"

"جہاں بھی گئے ہوں گے پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں۔"

"ائے اور کیا" باجی اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"زہرہ پھپھی کے یہاں بھی تو جبل پور میں دفینہ نکلا تھا" باقری بوا کو یاد آیا۔

"نہ کہیں۔ زہرہ کے یہاں کہاں دفینہ نکلا تھا۔ جو نکل آیا ہوتا تو آج بیٹھی راج کر رہی ہوتیں۔ وہ تو زہرہ بتاتی ہیں دفینہ نکلنے کا قصہ۔ اصل میں ان کے بھائی کی سلہج کے یہاں نکلا تھا۔"

"کون، نبا کی بیوی؟"

"ائے شاباش ہے باقری، تم تو ایسی ننھی بنی جاتی ہو کہ کچھ یاد نہیں۔ نبا کیوں ہونے لگے، ایا کے یہاں نکلا تھا۔"

"کیا کروں بیوی۔ نگوڑ مارا بڑھاپا ایسا ہے، بعضے وقت بالکل شمار نہیں رہتا۔" یہ بڑھاپا انہیں زیادہ کھانے سے تو نہ روکتا تھا۔ اونٹ کے کوہان کی طرح پیٹ بھر لینے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔ ڈٹ کے کھاتیں اور پیٹ پر جمنے والی مٹاپے کی تہوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ کھانے سے منہ خالی ہوا تو پان کچر کچر چبنے لگتا۔ اسی لئے

Scanned with CamScanner

لڑکے بالے انہیں باقری بوا کے بجائے بکری بوا کہتے تھے۔ پان سے ان کے ہونٹ، باچھیں اور دانتوں کا چو کا مستقل سرخ رہتے۔

"ایا کے یہاں زیادہ نہیں نکلا۔ انہوں نے خود بتایا تھا ہمیں۔ ہمارے یہاں تو بہت آنا جانا تھا ان کا۔" ایا کا اصلی نام یحییٰ تھا مگر گھریلو عورتوں کے حلق سے اس قدر ثقیل ٹھیٹ عربی نام کیوں کر نکلتا۔ ایک کے بعد دوسری "ح" گلے میں سوکھی روٹی کی طرح پھنس کر رہ جاتی۔ چنانچہ یحییٰ پہلے "یایا" ہوا پھر مزید لگاوٹ کے بعد "ایا" ہوگیا۔

"پھر بھی کیا نکلا تھا؟" اچھی بی نے تجسس کے مارے آگے سرکتے ہوئے پوچھا۔

"سونا وونا نہیں نکلا۔ سوا من چاندی نکلی۔"

"نہیں نکلا سونا تو کون کمی پڑ گئی۔ چاندی تو ملی۔ سونا نہ سہی تو روپا سہی۔" باقری بوا نے کہا۔

"کیوں باجی اماں انہوں نے کے بکرے کٹوائے، سات کہ سترہ؟" اچھی بی نے ازراہِ تفنن پوچھا۔ ان کے لئے یہ سارا قصہ دلچسپ طویل مذاق تھا۔

"نہ کہیں، سات نہ سترہ۔ کچھ بھی نہیں صدقہ کروایا۔ ان کے یہاں گرمیوں میں سب صحن میں سوتے تھے۔ تم نے تو جبل پور کی گرمی دیکھی نہیں، تمہیں کیا پتہ۔ دن میں دیواروں تک سے گرمی کی لپٹیں نکلتی

Scanned with CamScanner

ہیں۔ کئی کئی آدمی لُو لگنے سے مر جاتے ہیں۔ رات کو ذرا ٹھنڈک ہوتی ہے، بس رات ہوئی اور سب نے صحن میں پلنگ بچھائے۔ ٹھنڈی سفید چادروں پر لیٹتے تھے، ایسا بھلا لگتا تھا۔ چاندنی راتوں میں دیر تک جاگتے رہتے تھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں تو کئی دفعہ ان کے یہاں رہ رہ کے دیکھ آئی۔ ان کے یہاں کیا ہوا گرمیوں کے دن تھے، وہیں صحن میں سب لیٹے تھے۔ رات کو انہیں فرش کے نیچے کھن کھن کی آواز سنائی دی جیسے کوئی بھاری زنجیر کھینچ رہی ہو۔ پہلے تو انہوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ کئی دن تک کھنا کھن ہوتی رہی۔ پھر انہیں خیال آیا کہ دیگ بول رہی ہے....."

"دیگ بولتی بھی ہے؟" اچھی بی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ائے تم کیا جانو۔ تمہیں تو بات بے بات مذاق سوجھتا ہے۔ دیگ زمین کے نیچے چلتی ہے تو آواز ہوتی ہے۔ دیگ کے اندر اشرفیاں چھنکتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ ہندستان کے ذرّے ذرّے کے نیچے دفینے ہیں اور دیگیں زمین کے اندر چل رہی ہیں۔ بیٹی، یہ سب بادشاہی وقتوں کے دفینے خزانے ہیں جو شہزادے شہزادیوں نے وقت پڑے کو دبا دیئے تھے اور ان کے اوپر مال کے سانپ بٹھا دیئے تھے حفاظت کو ------ وہی دیگیں زمین کے اندر چلتی رہتی ہیں کہ کوئی غلط آدمی انہیں نہ نکال لے۔ یہ لکشمی یونہی ہاتھ نہیں آتی۔ اس کو مسخر کرنے کے لئے بھینٹ دینا پڑتی ہے۔"

Scanned with CamScanner

"ایا کے یہاں کا بتاؤ بیوی، یہ کیا دُکھڑا لے کر بیٹھ گئیں!"
باقری بوا نے ٹوکا۔

"اے لو، وہ بات تو رہ ہی گئی۔ ادھر تو وہ آوازیں سنائی دیں ادھر ان کی بیوی کو خواب میں لال لال سی عورت نظر آئے جو زبان نکال نکال کر کہے کہ جیتا بیٹا دے تو دھن ملے گا، جیتا بیٹا دے تو لکشمی ملے گی۔ وہ ایک بھُرڈلی تھیں، اپنے بڑے لڑکے کو چٹاچٹ ہمارے یہاں بھجوادیا ڈر کے مارے اور میاں سے کہنے لگیں کہ کوئی ڈائن بلا معلوم پڑتی ہے بھوگ کھلواؤ اسے۔ ایا نے بے صبری میں نہ پنڈت بُلوایا نہ جاپ کروایا، بھاگم بھاگ مدد لگوائی اور آنگن کھدوا ڈالا۔ فرش کے اندر سے ککیا اینٹ کی چُنائی نکلی۔ اس کے اندر باولی تھی جسے اینٹوں سے چُن دیا گیا تھا۔ اب جو باولی پھڑوائی تو اس کے اندر سے چاندی نکلی۔ ائے پہلے تو یہ لمبے لمبے سانپ سرسراتے ہوئے نکلے۔ کوئی آٹھ دس سانپ ہوں گے، اور یہ لمبے کہ دیکھ کر جی ہول جائے۔ سانپ دیکھ کر سب دہم رہ گئے، پھر ڈنڈے بلّیاں لے کر انہیں مارنے دوڑے، مگر ایک مزدور بڈھا ہوشیار تھا، دُنیا دیکھے ہوئے تھا، اس نے منع کیا کہ یہ سانپ دفینے کے نگہبان ہیں، انہیں مارو گے تو آفت میں پھنس جاؤ گے۔ سانپ لہرا لہرا کر ادھر ادھر غائب ہو گئے مگر جاتے جاتے کہہ گئے کہ تم نے ہمیں گھر سے بے گھر کیا، بِن پوچھے ہماری نیند غارت کی اور بھوگ نہیں کرایا، ہم تمہیں خاک کر دیں گے۔"

"سانپ اردو بولتے ہیں، کیوں باجی اماں؟" اچھی بی نے پوچھا۔

"تم پھر ٹھٹھول کرنے لگیں۔ نہ بچی سانپ کا مذاق نہیں اچھا۔ وقت بے وقت نام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ جٹا دھاری سانپ رشیوں مُنیوں کی جُون ہوتے ہیں، قالب بدل کر گھومتے ہیں۔ ان سے ڈرنا چاہیئے اور ایا نے جلد بازی کا نتیجہ بھی تو بھگتا۔ دولت ملی تو ملی پلا پلایا لڑکا ہاتھ سے جاتا رہا....."

"ہیئے ہیئے کیا ہوا؟" اچھی بی کو احساس ہوا کہ جسے وہ اب تک سٹھیائی ہوئی بڑھیوں کی ذہنی اختراع سمجھ رہی تھیں اس میں المیے کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

"کیسا کڑیل بانکا جوان تھا قاسم۔ سمجھو اب تک اس کی صورت نگاہوں میں پھرتی ہے۔ مُدتوں اس کے مرنے کا یقین نہیں آیا، اسے مردہ کہتے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کئی دن ہمارے یہاں رہا۔ جب واپس جبل پور جانے لگا تو جانہار مجھ سے کہنے لگا چچی اب تو ہمارے ابا دھنوان ہو گئے ہیں ولایت بھجوائیں گے مجھے پڑھنے کے لئے۔ میں نے کہا نہ بھیا سمندر پار جانا ٹھیک نہیں ہوتا، خدا خیر کرے۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ سمندر پار کی نوبت نہیں آئے گی اور وہ دنیا سے پار ہو جائے گا۔ میں نے کہا ولایت نہ جانا، کہتے ہیں سات سمندر لانگھنے والے کو بلائیں لگ جاتی ہیں۔ وہ میرا مذاق اڑانے لگا کہ آپ فکر نہ کریں میں ولایت

سے میم ساتھ لگا کر نہیں لاؤں گا۔ ہئے ہئے کیسا یاد آتا ہے، دن بھر سلطانہ سے کیرم کھیلتا رہتا تھا اور شام کو بھیا کے ساتھ گھومنے جاتا تھا۔ ایک دفعہ دونوں خربوزوں کی فالیز سے خربوزے توڑ کر بھاگے تھے تو رکھوالا ڈنڈا لے کر پیچھے دوڑا تھا، پھر تمہارے ابا جی نے پیسے دے دلا کر معاملہ ٹھنڈا کیا تھا۔ دو تین ہفتے رہ کر وہ واپس جبل پور چلا گیا۔ اس کو گئے ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ تمہارے بھیا کے نام تار آگیا قاسم کو سانپ نے کاٹ کھایا، سارے بدن میں زہر چڑھ گیا۔ میں تو سناؤنی سنتے ہی ہکا دکا رہ گئی، اسی وقت بدحواس ہو کر بیٹھے سے اٹھ کر جبلپور روانہ ہو گئی۔ تمہارے بھیا ساتھ گئے تھے۔ قاسم سے میری سلطانہ کی ٹھیکرے کی مانگ تھی، برس دن بعد خیر سے نکاح ہونا تھا۔ وہ نگوڑی اس کے غم میں بستر سے ایسی لگی کہ پھر نہ اٹھی....."

باجی اماں یاد کرتے کرتے خاموش ہو گئیں۔ سفید بالوں سے ڈھکے سر میں ماضی کے ورق پلٹنے لگے..... یادداشت کا جو عمل اب تک زبانی ہو رہا تھا خاموشی کے بوجھ سے دب کر ذہنی طور پر ہونے لگا۔

"پھر کیا ہوا؟" اچھی بی کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"ہونا کیا تھا۔ کوئی قصہ کہانی ہے جو کچھ ہوتا۔ ایا کی بیوی سارے گھر میں بولائی پھرتی تھیں، لڑکے کے لئے ہڑکتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں کہ دولت نہیں چاہیئے لڑکا دلا دو، لڑکا واپس دلا دو، جو کچھ اور ہے سب لے لو ہمارے قاسم کو واپس منگا دو۔ مگر کوئی مرا اب

تک واپس مِلا ہے جو وہ لوٹ آتا ؟ اس کے مرنے کے تیرہ دن بعد رات کو انہیں خواب دِکھا کہ پہلونٹی کا لڑکا مایا کی بھینٹ چڑھ گیا، باقی کی خیر چاہتی ہو تو خوش کر دو۔ اس کے بعد انہوں نے سات دن تک روزانہ تین وقت پانڈے کھِلائے۔ ہندو حلوائی گھر آتا تھا، الگ برتن تھے، اور وہ وہیں بیٹھ کر پوری کچوری لڈو بناتا تھا۔ پنڈت، جوگی ودّیارتھی آکے کھاتے تھے۔ ان میں سے ایک جوگی نے مشورہ دیا کہ دودھ کے تھال رات کو صحن میں رکھوا کر سویا کرو۔ تو انہوں نے سات تھال یہ بڑے بڑے دودھ کے رکھوائے اور کڑھاؤ منگوائے، صبح اٹھ کر دیکھیں تو تھال خالی۔ سانپ دودھ پی کر چلے جاتے تھے اور انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ اور وہ جو باولی تھی، سمجھو گزوں تو اس کا پھیر ہوگا، اس کے دونوں طرف کھبے گڑوا کے گھِرّی لگوا دی۔ گھر آنگن کا کنواں ہو گیا۔ ایسا میٹھا پانی تھا اس کا جیسے شکر گھُلی ہو۔ سانپ کی وجہ سے مٹھاس ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں سانپ جس مٹی پر تھوک دے اس کی تاثیر بدل جاتی ہے۔"

"خون کا پیسہ ہو گیا۔ ایسی دولت کس کام کی جو بیٹا دے کر ملے" اچھی بی بولیں۔

"نہیں بی، دولت کی بات نہیں، وہ تو ایا نے جلد بازی دکھائی۔ اگر چڑھاوا چڑھایا ہوتا تو مفت میں لکشمی گھر آجاتی۔"

"اے بی نصیبوں کا پھیر ہے۔ قسمت والوں کو ملتا ہے" باقری بوا

نے بولنا ضروری سمجھا۔ وہ کیوں کسی بات میں پیچھے رہتیں۔ "ایک ہم ہیں کہ دیکھ لو آج تک راستہ چلتے گری پڑی ایک پائی نہ ملی اور اُلٹا نقصان ہو گیا کہ پانچ روپے کا نوٹ ایک دفعہ سڑک پہ گر گیا اور ایک دفعہ سونے کی نتھنی کھوئی گئی۔ کس چاؤ سے ننھی کے ابا نے نتھنیا بنوا کر دی تھی۔ منہ دھونے کے لئے جو اتار کر موری کے پاس رکھی تو کوا لے اڑا جنیں کھانے کی چیز سمجھا مُوا یا چمک دمک پہ فدا ہو گیا۔ میں چلائی کہ دوڑو دوڑو کوا نتھنی لے اڑا۔ سامنے سے تمہارے بھیا آ رہے تھے وہ بجائے اس کے کچھ مدد کرتے مذاق میں آ کر منہ سے بجا بجا کر گانے لگے 'کا گا نتھنیا لے کر بھاگا'....."

"ہاں بھئی اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ یوں ہما شما کو لکشمی مل جو سکتی تو پھر کیا تھا گھر گھر ہُن برس رہا ہوتا۔ اندھے کی ریوڑیاں تو ہیں نہیں۔" اچھی بی نے فوراً بولنا ضروری سمجھا ورنہ انہیں خطرہ تھا کہ باقری بوا نتھنی کھونے کے بعد پانچ روپے کا نوٹ کھونے کا قصہ بھی سنانا نہ شروع کر دیں۔ باقری بوا کو یہ نہیں پتہ تھا کہ کہا نی کہنے سے دُکھ کم نہیں ہوتا۔

"نہ جانے اس کا کیا منتر ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے گھر کے گھر بھرے ہوئے ہیں، دولت کی ریل پیل ہے، لکھ لُٹ رہے ہیں۔ اب شفو کے گھر والوں کو دیکھ لو۔ باپ نہ دادے چودہ پشت حرام زادے۔ ہمارے وہاں دری بیچا کرتے تھے، جب دیکھو حویلی

کے پھاٹک پر کھڑے ہیں کہ دریاں چاندنیاں خرید لو۔ ارے بھئی ایک دفعہ کہہ دیا کہ نہیں چاہئیں۔ ذات کے جولاہے دُری بُنتے بُنتے انگلیاں موٹی پڑ گئی تھیں اور اب دیکھ لو کہ وہ ٹھاٹ ہیں۔ چھ چھ گاڑیں دروازے پر کھڑی ہیں، کوٹھیں بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، صورت حرامیوں کی ہوا بدل گئی۔ پچھلے سال میری سلمیٰ کا رشتہ مانگنے آنا چاہ رہی تھیں شفّو کی اماں۔ میں نے سروری سے کہلوا بھیجا کہ اپنی اوقات پہچانو۔ لو بھئی ہم نے تو صاف ٹکڑا توڑ کے رکھ دیا وہ سیّدوں کی بیٹی بیاہ لائے اور ہنڈتے پھرتے ہیں۔"

اچھی بی نے تنک کر کہا "ان کا کیا ہے، وہ اسمگلنگ کرتے ہیں، دیکھ لینا ناک کے راستے ایک دن ساری دولت نکل جائے گی۔ ان کا جیسا کالا پیسہ اللہ کسی کو نہ دے۔"

باقری بوا نے بھی فوراً ٹکڑا جوڑا "اور آپا صُغریٰ کے گھر والوں کو دیکھ لو۔ ان کے تو بچے بچے کی ہڈی بوٹی رشوت کی بنی ہے۔ بڑا لڑکا پکڑا گیا تو کیسا چالیس راتوں تک انہوں نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وظیفہ پڑھا تھا اور اب ناک پر سے مکھی نہیں ہلاتیں۔"

"جو کرتے ہیں سو کرتے ہیں۔ میں تو یہ جانوں کہ شفّو کی اماں جو شادی بیاہ، مصروفیت کے دنوں میں ہمارے یہاں اُجرت پر سلائی کڑھائی اور کھانا پکانے کا کام کرتی تھیں، اب سونے میں پیلی بیٹھی ہیں۔ کالا دھن ہو گا تو ہوا کرے، ان کو تو لال پیلا کر گیا۔"

Scanned with CamScanner

"جن ہاتھوں سے ہمارے یہاں کی جھوٹی پتیلیاں مانجھا کرتی تھیں، اُن ہاتھوں میں اتنا سونا اور ہیرے پہنے رہتی ہیں کہ ہمارا گھر بک جائے تو اس کے دام نہ پورے پڑیں۔" اچھی بی نے کہا۔

"ائے بی قسمت ہے۔ ہم تو وہاں لاکھوں کا گھر لٹا آئے اور یہاں آکر یہ حالت ہو گئی کہ پیسہ پیسہ دانت سے پکڑنا پڑتا ہے۔ ہم تو ویسے کے ویسے رہ گئے، دوسرے یہاں آکر بھی نہالوں نہال ہو گئے، سامان سے بھری کوٹھیاں قبضے میں کر لیں۔"

"خدا جانے کس چکی کا کھاتے ہیں یہ لوگ، دولت کمانی تو کیا ہم سے تو جو ملا تھا وہی نہیں سنبھالا جا سکا۔ وہاں تمہارے بھیّا سے کہتے کہتے ہڑ گئی کہ سامان کا کچھ کر لو وہ ہر بار ہوں ہاں کر کے ٹال جائیں کہ کچھ نہ کچھ کر لوں گا، آخر کسٹوڈین والے آکر سارے میں مُہریں لگا گئے۔ وہ سب چھنا، یہاں آکر کلیم داخل کیا، مہینوں برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ڈربہ قسمت سے جُڑا تو اس میں بھیّا نے اپنے دوست کو کرایہ دار لاکر رکھا وہ مکان ہی ہضم کر گیا۔ جن کے پاس وہاں نہیں تھا انہیں یہاں مل گیا ہم منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔"

"سروری بوا کہتی ہیں کہ پنجاب کی طرف لوگوں کو ہندوؤں کا بہت ملا۔"

"خود سروری بی کو کیا کم ملا؟ حسن ابدال میں جا کر رہی ہیں، وہاں کسی سکھ کے مکان کا تالا تڑوا کر اس میں گھس بیٹھیں۔ اس

مکان میں سے کسیرئیں، تجوریئیں، بکسے، تانبے کے ارتن برتن جانیں کیا کچھ ملا۔"

"ہاں سروری بی کو خوب سامان ملا۔ اور وہ جو سکھنی جس کا گھر تھا وہ بعد میں پنجہ صاحب کی زیارت کو ہندوستان سے آئی تو اپنا پرانا مکان دیکھنے کے لئے بھی آئی اور انہیں بتا گئی کہ صحن میں پیسے دفن ہیں۔ کہنے لگی واہگورو نے تمہارے نصیب سے ہمارے پیسے دفن کرائے تھے، تمہی لے لو۔" باقری بوا نے بتایا۔ ان کی سروری بوا سے ہمیشہ چلتی رہتی تھی اس لئے انہیں سروری بی کو اتنا سامان اور پیسہ مل جانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔

"وہ تو دور کی بات ہے۔ الطاف ماموں نے جو عامل کالونی میں ایک ہندو کا بھرا پرا گھر لے لیا یہیں کراچی کے کراچی میں۔"

"ائے ان کی نہ کہو۔ ان کو تو یہ ملک ایسا راس آیا جیسے مچھلی کو پانی۔ وہاں جھک مارتے تھے، کوئی پوچھتا نہ تھا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مملکت خداداد پاکستان بن گئی۔ گھس پل کے ایک دفتر میں ہو گئے۔ وہاں کلرکی کرتے تھے یہاں خدا کی شان افسر ہیں اور ملنے ہم سے اس لئے نہیں آتے کہ ہماری گلی چھوٹی ہے اور ان کی کار بڑی۔ ہم کو عزیز رشتہ دار بتاتے ان کی شان میں بٹا لگتا ہے۔ ائے ہم وہ دن بھولے تھوڑی ہیں جب جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے ہندوؤں کے مکانوں پر قبضہ کرنا شروع کیا اور ان کو پگڑی پر اٹھا کر دولت مند

بن گئے۔"

"ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جن کے پاس وہاں نہیں تھا انہیں یہاں مل گیا اور جو یہاں کچھ نہیں وہ وہاں بہت کچھ ہو گئے ہوں گے۔ ایک ہمیں پھنسے رہ گئے"، اچھی بی نے تلخی سے کہا۔

"ہئے ہئے، کوئی پوچھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہم وہی منجھلے میاں والے ہیں جنہوں نے ایسے ایسے نہ جانے کتنے مکان یتیموں بیواؤں کو خیرات کر دیئے۔"

"جو کہیں بڑی حویلی کا دفینہ ہمارے تمہارے زمانے میں نکل آیا ہوتا تو دن پھر گئے ہوتے۔" باجی اماں نے کہا۔ ایسا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا، یوں سوچنا ان کی عادت بن گئی تھی۔

"منجھلے میاں نے کیا تھوڑے جتن کئے دفینے کے لئے؟ بڑے بڑے مولوی سیانے بلوائے، حصار کھنچوائے، نجومیوں سے نقشے بندھوائے، منت مانی، چلّے کاٹے، برہمنوں سے ستاروں کو دکھوایا، کون سی کسر تھی جو چھوڑی ہو۔ ایک دفعہ کسی نے کہہ دیا کہ تہ خانے میں دفینہ ہوگا تو سارا تہہ خانہ کھود ڈالا مگر نکلا نکلایا کچھ نہیں۔ کھُدوا کھُدوا کے سارا مکان کھنڈیلا بنا دیا، ملا خاک نہیں، اور ان کے نام کی دولت پر دوسرے عیش کر رہے ہیں۔"

"بے چاری بڑی ماں تو اسی دفینے کے چکر میں دیوانی ہو گئی تھیں۔ ہر وقت یہی کھاتا کھولے رہتیں کہ اکیاسی ہزار کی اشرفیں

نکلیں گی تو پندرہ ہزار اچھی کو دوں گی، پندرہ ہزار مجو کو دوں گی، باون روپے درزی کی بیوی کو دوں گی، یہ کروں گی وہ کروں گی۔ جہاں کسی سے ناراض ہوئیں فوراً اس کے حصے کی رقم آدھی کر دی اور جس سے خوش اس کا حصہ دوگنا کر دیا۔" اچھی بی نے کہا۔

"ائے کوئی پاگل آگل نہیں ہوئی تھیں۔ پاگل کاہے کو ہوتیں۔ یہ تو مجو نے اُڑائی تھی کہ ان کے زیور اس بہانے ہتھیالے پاگل ہوتے ان کے دشمن، ہاں ہر وقت دفینے کا سوچ سوچ کر جی مُنڈا سہنے لگا تھا،، باجی اماں نے وضاحت کی۔

باقری بوا نے افسوس بھرے لہجے میں کہا "جس کو ملنی ہوتی ہے اسی کو مل کے رہتی ہے۔ کوئی دوسرا وہاں پہنچ بھی جائے تو مٹی بن کر اوجھل ہو جاتی ہے" دفینہ نہ ملنے کے افسوس میں وہ بھی حویلی والوں کی برابر سے شریک تھیں۔ آخر وہ بھی تو حویلی میں رہی تھیں، یہ اور بات ہے کہ اب انہیں کوئی ساتھ نہ رکھتا تھا کہ نہ گھر میں جگہ تھی نہ دلوں میں گنجائش۔

"ائے مجھے تو وہ وقت یاد آتا ہے جب لالہ بھارت بھوشن روز کا اُٹھنے بیٹھنے والا قرقی لے کر آیا تھا۔ منجھلے میاں منجھلے میاں کہتے مُنہ سوکھا جاتا تھا، غلاموں کی طرح دست بستہ کھڑا رہتا تھا اور سُود پر قرض دے دے کر اندر ہی اندر سیاہ سفید کا مالک

Screenshot has been saved to Pictures/Screenshot

Scanned with CamScanner

بن بیٹھا۔" باجی اماں بولیں۔

"اس نے بہت چاہا کہ منجھلے میاں حویلی میں رہتے رہیں اور اسے کرایہ دے دیں مگر منجھلے میاں نہ مانے کہ بھئی جب تم نے لے لی تو تم کو مبارک ہم کہیں اور سر چھپانے کا ٹھکانہ کر لیں گے۔ اس کے بعد زیادہ دن جیئے نہیں وہ ..... لاکھ کا گھر خاک ہو گیا، کوڑیوں کے مول حویلی بِک گئی۔ اس کے بعد شیرازہ بکھر گیا۔ پھر جمع پونجی جوڑ جاڑ کے جو مکان سامان لیا وہ کسٹوڈین کی نذر ہو گیا....."

"ہاں بی۔ ہندوؤں کی قسمت کا ہے۔ حویلی بھی لے لی، دفینہ بھی لے لیا۔" اچھی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اگر آپ کی بے دھیانی سے کسی دوسرے کا مالی فائدہ ہو جائے، اسے پیسہ مل جائے جیسے آپ نادانستہ طور پر انعام نکلنے والا پرائز بانڈ یا لاٹری کا ٹکٹ کسی دوسرے کو بیچ دیں تو سانسیں ٹھنڈی برف ہو جاتی ہیں اور ہاتھ نہ آنے والی دولت پر یوں افسوس ہوتا ہے جیسے آپ ہی کے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ ایسے میں قسمت کے سوا الزام کس کے سر تھوپا جائے؟

منّی جو لوکی چھیلتے میں یہ ساری گفتگو سن رہی تھی اور اس لئے چپ تھی کہ ادھر بولی ادھر کسی نے کام سے اٹھایا، سنتے سنتے بولی "اگر ان ہندوؤں سے جا کر کہیں کہ اللہ یہ دفینہ ہمارا

ہے، اللہ ہم کو لوٹال دیو نہ اللہ، تو وہ دے دیں گے کیا؟"
اس کو کچھ ایسا خیال تھا کہ چھوٹے بھیّا کھیلتے میں اس کے ہاتھ سے کتارے املی یا کنچے چھین لیتے ہیں اور اس کے رونے دھونے، منّت سماجت یا اچھی بی کی مار کے ڈر سے واپس کر دیتے ہیں۔

"نہیں بی - اب ہمارا کیا حق رہ گیا - حویلی چھوڑی ویسے دفینہ بھی چھوڑا - جیسے زمین چھوڑی ویسے زمین کے اندر کا بھی سب چھوڑ دیا۔" باجی اماں نے اس کسمپرسی میں کہا جیسے انہیں کوئی دل پسند کھلونا چھوڑنا پڑ رہا ہو اور وہ اسے چھوڑنا بھی نہ چاہ رہی ہوں۔

"جنیں کتنا نکلا ہوگا؟"

"جنیں ملا کس کو ہوگا، جو ہمیں مل جاتا....."

"ایک دفعہ میں خود دیکھ لیتی تو کلیجے میں چین پڑ جاتا۔"

"ائے بنّن کی دلہن سدا کی جھوٹی لپاڑن ہیں، پر کا کوّا بنانے والی، ایک کی دس لگائیں گی۔ ان کی کسی بات کا کیا ایمان اعتبار؟ کیا پتہ دفینہ نکلا ہی نہ ہو۔" اچھی بی بولیں۔ شکستہ تخت پر بیٹھے ہوئے اور آنگن کے جھلنگا ڈھیلے پلنگوں، کھری چارپائیوں، چٹخے برتنوں اور الگنی پر لٹکے میلے کپڑوں کے درمیان یہ خیال بہت اطمینان بخش تھا۔

"ہاں ان کا کیا ہے، وہ اپنے ایسے ہی اُڑا یا کرتی ہیں۔" باجی اماں

نے تائید میں سر ہلایا۔

"کوئی نہیں نکلا ہوگا دفینہ افینہ۔ نکلنا ہوتا تو ہمارے زمانے میں نکل آیا ہوتا۔ ارے ارے دیکھو نگوڑ ماری مرغی پھر کیاری میں گھس گئی۔ پیاروں پیٹی ذرا نہیں رہنے دیتی، نوچ پھینکے دیتی ہے۔ اری منی او منی ہٹاؤ اس کو۔" وہ چلائیں اور پیر سے جوتی اُتار کر مرغی پر ماری۔ جوتی اسے کیا لگتی کیاری میں گر گئی، مرغی بھدر بھدر کرتی بھاگ گئی اور باجی اماں بکتی جھکتی رہ گئیں۔

(۱۹۷۹ء)

Converted by SAQI

Scanned with CamScanner

ہیرے جیسی کہانی

کہانی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مطلب یہ نہیں کہ کہانی اَن مول ہے، بِک نہیں سکتی کہ اگر ایسا ہوتا تو ہم کہانی کار کھاتے کہاں سے، مراد یہ ہے کہ کہانی کار کا وہ تجربہ جو کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ کہانی جو سُننے والے کے لئے تجربہ بن جاتی ہے، اسے اپنی خواہش کے مطابق یا کوئی قیمت ادا کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یا تو از خود اندھیری گھٹا میں سے کوندے کی طرح لپکتا ہے، یا پھر اِسے زندگی کی بے زار کن یکسانی اور اُکتاہٹ سے یوں اخذ کیا جاتا ہے جیسے زمین سے نکلنے والا ایک ملگجا ٹکڑا جو تراش لئے جانے کے بعد ہیرا بن کر دمکتا ہے۔ لیکن کبھی کہانی یوں بھی مل جاتی ہے جیسے راستے میں ہیرا پڑا ہوا مل جائے۔ آپ روزمرہ معمول کے مطابق سڑک پر چلے جا رہے ہوں کہ راستے میں پڑا ہوا دمکتا جھلملاتا ہیرا نظر آئے اور آپ اسے اُٹھا لیں: زندگی کی اسی روکھی پھیکی بے رنگی، یکسانیت اور بندھے ٹکے معمول کے دوران یہ اچانک حیرت زدہ کر دینے

والی چمکدار اور قیمتی چیز، ہیرے جیسی کہانی۔ ایک بڈھے نے مجھے یہ کہانی سنائی۔

وہ بہت زدہ حال بوڑھا تھا، افلاس اور آوارگی کا مارا ہوا۔ مئی جون کی چلچلاتی گرمی، بھاڑ سا بھن رہا تھا۔ شہر کی پیہم رواں سڑکیں سونی پڑی تھیں۔ اِکا دُکا راہ گیر جو گرمی سے بوکھلائے جا رہے تھے اور سفر سے زیادہ منزل تک پہنچ جانے کی جلدی میں تھے، ٹھیلے والے زیادہ بکری کی جگہوں کو چھوڑ کر فٹ پاتھ کے کنارے لگے دو چار پیڑوں کے آس پاس سائے کی تلاش میں منڈلا رہے تھے، گاڑیوں کی آمد و رفت بہت کم تھی، تارکول کی سڑکیں دھوپ میں تپ رہی تھیں اور فٹ پاتھ تپ کر انگارہ ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سارا شہر نصف النہار پر پہنچے ہوئے سورج کی تیز روشنی اور دھوپ سے چوندھیا گیا ہے۔ میں برنس روڈ سے پیدل چلتا ہوا آرٹس کونسل کی طرف جا رہا تھا۔ چلتے چلتے گرمی سے بے دم ہو گیا تو سوچا کہ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے تو لاؤ چائے ہی پیتے چلیں۔ اس سڑک پر خیراتی شفاخانے کے قریب ایک بغلی گلی میں چھوٹا سا چائے خانہ ہے جس کی آمدنی کا دارومدار قریبی واقع انکم ٹیکس دفتر میں ہر وقت لگی رہنے والی بھیڑ پر ہے، برابر میں صوبائی سیکریٹریٹ اور قومی عجائب گھر کی عمارتیں پتلی سی سڑک پر چھائی ہوئی لگتی ہیں۔ عجائب گھر کی چار دیواری میں ایک کینٹن ہے جس میں ناریل بکتے ہیں،

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned with CamScanner

برنس گارڈن کے ناریلوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے، اس سے آگے گندے نالے پر پُلیا بنی ہوئی ہے اور اس کے برابر آرٹس کونسل ہے، وہیں وہ چائے خانہ ہے، بالکل عام سا چائے خانہ جس وضع کے چائے خانے کراچی کے ہر گلی کوچے میں موجود ہیں، میلا فرش، چٹخے ہوئے برتن، صفائی ستھرائی نام کو نہیں اور فالتو قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا جن کا زندگی میں کوئی مقام نہیں، بیمہ ایجنٹ، دوا ساز کمپنیوں کے سیلز مین، شاعر، پیشہ ور دھوکے باز، یعنی وہ لوگ جن کا ذریعۂ معاش دوسرے کو اپنی چرب زبانی سے متاثر کرنا ہے۔

پالش اکھڑی لڑکھڑاتی لنگڑی کرسی کھینچ کر میں بیٹھ گیا اور ملازم چھوکرے سے چائے لانے کو کہا۔ "صاب کو ایک دودھ پتی مارو" چھوکرے نے چائے خانے کے کچن" میں جا کر آرڈر دیا، جو دراصل وہ کونہ تھا جس میں خشک لکڑیوں کے جلتے ہوئے گٹھے پر دھوئیں سے کالی کیتلی یوں سلگ رہی تھی جیسے کوئی جل ککڑا شخص اپنی جھونجھ میں ہو۔ چائے کی پیالی میرے سامنے لا کر رکھی گئی تو وہ بوڑھا نہ جانے کس کونے کھدرے سے نکل کر آ گیا اور دوسری کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ "اے بھیا ذرا ایک کڑک چائے ہمیں بھی پلا دو، صبح سے طلب ہو رہی ہے"۔

کھچڑی داڑھی کے سفید سیاہ بالوں نے پچکے کلوں والے لمبوترے

چہرے کے پکے رنگ پر چائے خانے کا نمونہ سا بنا دیا تھا، بھیلے نما ڈھیلی گیبر ڈین پتلون کو ایک پٹی سے کمر کے گرد زبردستی کس لیا گیا تھا، پٹی کا چمڑا سوکھ کر تڑخنے لگا تھا اور وہ بیلٹ کے بجائے کمربند معلوم ہو رہی تھی، گھونسیا رنگ کی پتلون جس کا کپڑا کولھوں اور گھٹنوں پر سے چھج گیا تھا، جس پر میل کے چکتے پھیل کر یوں جذب ہو گئے تھے کہ پتلون کا اصلی رنگ پہچاننا مشکل تھا، ڈھیلا کوٹ جو بلاشبہ دو دو روپے پرانے کپڑے اور گودڑ بیچنے والے سے مول لیا گیا تھا، اور ٹائی کے نام پر سُتنا سیاہ پٹی گلے میں بندھی ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پرانے اخباروں کا سُتلی سے بندھا ہوا بنڈل، اخباروں کے کنارے پیلے ہو چکے تھے (میں نے نوٹ کیا کہ وہ سب انگریزی کے اخبار تھے)، سر پہ رُواں نُچی جناح کیپ اور دوسرے ہاتھ میں ہرے رنگ کا بہت بڑا سفری بیگ جس میں پتہ نہیں کیا تھا کہ اس نے زمین پہ لٹکایا تو دَھپ کی آواز آئی۔

,,قسم اللہ پاک کی، صبح سے چائے کی طلب لگ رہی ہے،، اس بوڑھے آدمی نے مجھ سے کہا۔ میں نے چھوکرے کو اشارہ کر دیا اور اس نے خالی پیالی اس کے سامنے لا کر دھر دی۔ بوڑھے نے کھولتی ہوئی کیتلی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور اتنی تیزی سے پیالی میں چائے انڈیلی کہ آدھی چائے پیالی کے بجائے چائے دانی کی ٹونٹی سے نکل کر میز پر پھیل گئی۔ پیالی سے چائے اس نے طشتری میں

انڈیلی اور سڑپ سڑپ کر کے پینے لگا۔ وہ یوں چائے پی رہا تھا جیسے بلی زبان نکال کر طشتری چاٹتی ہے۔ اس نے میرے چہرے پر اپنے لئے ناگواری پڑھ لی ہو گی کیونکہ اس نے پیالی میز پر ٹکا دی، پھر ایک ہی سانس میں ساری پیالی چڑھا گیا اور مجھ سے کہنے لگا "ہمارا بُرا وقت آگیا جو جیب سے ایک پیالی چائے کے دام نہیں نکلتے اور تیرا میرا منہ دیکھنا پڑتا ہے، ورنہ یہ حالت تھی کہ نیلم اور ہیروں میں کھیلتا تھا، بھر بھر مٹھی نیلم ہیرے پکھراج زمرد اور یاقوت اُچھالتا اور ہیرے مُٹھی میں سماتے نہیں تھے" اس نے کہا اور دودھ دان میں بچے ہوئے ایک گھونٹ دودھ میں چینی گھول کر اپنے حلق میں انڈیل لیا، پھر ذرا آگے ہو کر بہت رازداری سے میرے کان میں کہنے لگا۔ "مگر آپ یہ کسی سے کہئے گا نہیں۔ کسی کو پتہ نہ چلے، بمبئی کی خفیہ پولیس میری تلاش میں ہے۔۔۔۔"

کرسی سے ٹیک لگا کر اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ "گھبرائیے نہیں، میں ڈاکو یا لٹیرا نہیں ہوں۔ آپ کسی کو بتائیں گے تو نہیں؟ اصل قصہ کیا ہوا، میں آپ کو بتاؤں۔۔۔۔ اے چھوکرا صاحب کے آرڈر پر دو کڑک چائے۔۔۔۔ نام تو میرا ہے محبوب حسین خان مگر جہاں کا میں رہنے والا ہوں وہاں سب لوگ بفاتی بفاتی کہتے تھے مجھے۔ میرے باپ میاں غوثو کہلاتے تھے، افیم کے ٹھیکیدار تھے، افیم بیچا کرتے تھے اور خود بھی افیم سے شوق فرماتے تھے بہن بھائی

کوئی تھا نہیں میرا، ماں مدتوں پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ابا نے ایک کنچنی نصیبن نامی کو گھر ڈال لیا تھا۔ دن رات اس کے چاؤ چونچلے کیا کرتے۔ میری انہیں کچھ فکر نہ تھی، دن رات میں بن ٹھنے بیل کی طرح شلنگیں بھرا کرتا، اسکول سے بھاگنے لگا، من میرا موجی تھا اور طبیعت سیلانی، مزاج میں آوارگی آگئی۔ ایک دفعہ قصبے کے سات آٹھ لڑکوں نے مل کر صلاح کی کہ چلو بمبئی بھاگ چلیں۔ اس کے لئے چاہیئے تھا پیسہ اور وہ ہم میں سے کسی کے پاس تھا نہیں وہ کم بخت رنڈی دن رات افیم میں غرق رہا کرتی تھی، میں نے ایک دن موقع تاک کر اس کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار لی۔ اس سے جو روپے ملے اور باقی کا بندوبست دوسرے لڑکوں نے کیا، غرض بڑی مشکلوں سے پیسہ جمع کیا۔ بمبئی پہنچے، خوب سیر سپاٹے کئے، جوہو اور چوپاٹی پر تفریح کرتے رہے۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو سب کو فکر ہوئی کہ اب کیا کریں۔ بہت کوشش کرتے رہے کہ کہیں کام مل جائے مگر جب کسی نے گھاس نہیں ڈالی تو آخر مجبور ہو گئے۔ سب نے اپنے اپنے گھر خط لکھے کہ غلطی ہو گئی معاف کر دو، ہم یہاں ہیں، کرائے کے پیسے بھجوا کر ہمیں بلوالو۔ سب کے گھروں سے خط کے جواب میں پیسے آگئے اور وہ تو اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے، میرے باپ نے نہ تو خط کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی نہ پیسے بھیجے۔ افیم کی پنک سے جاگتے تو اس رنڈی کے جھمیلوں میں پڑ جاتے، انہیں اولاد کی خبر گیری کا کہاں وقت تھا۔

Scanned with CamScanner

بمبئی میں بہت دھکے کھائے، پڑھا لکھا اتنا تھا نہیں کہ اچھی نوکری مل جاتی، اور مزدوری کرتے عار آتا تھا، آخر بہت مجبور جب ہوگیا تو ڈاک خانے کے سامنے جاکر بیٹھ گیا، کہیں سے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا لے آیا اور کہیں سے قلم دوات اُدھار کر کے لوگوں کے خط پتر چٹھیاں عرضیاں لکھنا شروع کر دیں۔ بہر نوع روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔ ایک دن ایک سیٹھ صاحب میرے پاس آئے، پارسی تھے، انہیں اردو میں ایک خط لکھوانا تھا۔ مجھ سے انہوں نے خط لکھوایا اور شریف صورت دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ میں نے بتایا کہ فلاں جگہ کا رہنے والا ہوں اور اِس اِس طرح سے پریشان ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم نوکری کرنا چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جھٹ اپنا بوریا سمیٹ سیٹھ جی کے ہمراہ ہو لیا۔ اپنی دوکان پر انہوں نے مجھے کام پر رکھوا دیا اور رہنے کا بندوبست اپنے مکان کے ایک کونے میں کر دیا۔ یہ سیٹھ جی جوہری تھے، تو یہ بمبئی شہر کے بہت بڑے نامی گرامی جوہری تھے، سیٹھ ہُرمزجی سُپاری والا نام تھا، جواہرات کا کام کرتے تھے، لاکھوں روپے کے جواہرات کا سودا ہوتا تھا ان کی دوکان پہ، ہیرے اور یاقوت اور موتی اور نیلم اور پکھراج، فیروزہ، زُمرد اور عقیق اور یہی سب۔ آوارہ مزاج تو میں تھا ہی، لیکن سیٹھ جی کا برتاؤ ایسا تھا کہ باپ کی بے اعتنائی کے سبب جو مجھ میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا، وہ ان کی شفقت

سے درست ہوگیا اور میں نے ایسا جی لگا کے کام کیا کہ سیٹھ جی میرے بہت ہی گرویدہ ہوگئے اور مجھ پر جتنا اعتبار وہ کرنے لگے اپنے لڑکوں پر بھی نہ ہوگا۔ دو لڑکے تھے ان کے، ہوشنگ اور بہرام۔ ایک لڑکا ان میں سے مجھ سے بہت التفات کرتا تھا، بھائی کی طرح سے سمجھتا تھا اور دوسرا میرے نام سے جلتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ بحرین سے کچھ عرب آئے اور سیٹھ جی کی دوکان پر موتی بیچنے کو لائے۔ سیٹھ جی نے جو موتی دیکھے تو پھڑک اٹھے، سڈول اور سبک اور آب ایسی کہ نگاہ نہ ٹھیرے۔ سیٹھ جی حیران رہ گئے کہ ایسے گول گول موتی اور خوش رنگ اور سب ایک برابر ناپ کے۔ عرب ان کے تیس ہزار مانگتے تھے، سیٹھ جی بیس دینے کو تیار تھے۔ پچیس ہزار پر سودا پٹ گیا، سیٹھ جی سیف سے روپے نکال کر دینے کو تھے کہ میں اس وقت دوکان کے اندر داخل ہوا اور سیٹھ جی سے کہنے لگا کہ سیٹھ صاحب یہ آپ نے کیسے موتی مجھے چھید کرنے کے لئے دیئے ہیں جن میں تھوڑا سا کاٹنے کے بعد برما چلتا ہی نہیں ورنہ موتی تو بڑی ملائم چیز ہے، بڑی آسانی سے چھد جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسے تو چھوڑو اور آ کے دیکھو کتنے عمدہ موتی ہم خرید رہے ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا کہ وہ موتی اتنے خوبصورت اور اُجلے تھے کہ اصلی نہیں ہو سکتے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا میں دوکان کے ایک کونے میں گیا اور وہاں سے چلّا کر کہا سیٹھ صاحب آپ کا فون آیا ہے، سن لیجئے۔ سیٹھ جی معذرت کر کے اٹھے اور ٹیلی فون کے پاس گئے، دوکان کے

اندرونی حصے میں فون تھا، وہاں آئے تو دیکھا کہ ٹیلی فون کا چونگا رکھا ہوا ہے، پوچھا کہ کیوں یہ کیا حرکت۔ میں نے ان سے کہا سیٹھ جی یہ جو موتی ہیں ان میں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے، میں نے سنا ہے کہ جاپان والے کسی ترکیب سے موتی خود بناتے ہیں، کلچرڈ پرل ان کا نام رکھا ہے، یہ جو موتی ہیں یہ اسی قسم کے نہ ہوں، آپ انہیں ابھی نہ خریدیں، پہلے دریافت کر لیں، اپنا اطمینان کر لیجیے۔ سیٹھ جی واپس آئے اور ان عربوں سے کہا کہ میرے گھر سے فون آیا ہے، میری بیوی کی حالت یک لخت خراب ہو گئی ہے اور میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے، اب اس وقت تو میں کچھ کر نہیں سکتا، آپ لوگ کل آئیں تب میں بات چیت کروں گا، اب تو میں گھر جا رہا ہوں۔ وہ عرب "یا اخی یا اخی" کرتے سر ہلاتے چلے گئے۔ شام کو سیٹھ صاحب نے اپنے جاننے والے چوٹی کے تین جوہریوں کو بلایا اور ان سے موتیوں کے متعلق پوچھا کہ یہ بفاتی یوں تو بہت جوہر شناس ہے، نظر بھر میں اصلی اور نقلی پہچان لیتا ہے اور اب یہ ایسی ایسی بات کہہ رہا ہے۔ ان میں سے ایک بوڑھا جوہری کہنے لگا کہ ہم نے سنا ہے کہ جاپان والوں نے یہ کیا ہے کہ سیپیوں کے منہ میں پتھر کی چھوٹی چھوٹی گولیاں داخل کر کے سیپی کو واپس چھوڑ دیا اور ایسا کیمیکل ڈالا کہ جو لعاب ان پہ چڑھتا ہے وہ زیادہ چڑھ جائے۔ سیپی کے اندر اگر کوئی کنکر پتھر ریزہ ایسی چیز چلی جائے جس سے اسے تکلیف ہو یا چبھے اور بے آرام کرے تو وہ ایسا لعاب پیدا کرتی ہے کہ

یہ تکلیف اور چبھن کم ہو جائے، یہ لعاب ریزے کے گرد جم کر موتی بن جاتا ہے (تشتری میں انڈیل کر بلّی کی طرح سڑپ سڑپ چائے پیتا ہوا وہ سیلانی بڈھا مجھے موتی کی پیدائش کا حال بتا رہا تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تجربے اور تخلیق کی کتنی عمدہ تشبیہ بن سکتی ہے) بڈھے نے مجھ سے پوچھا "آپ کو پتہ ہے موتی کیسے بنتا ہے؟ پہلے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ جب ابرِ نیساں برستا ہے تو پانی کی وہ بوند جو سیپی کے منہ میں چلی جاتی ہے موتی بن جاتی ہے مگر تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ صورت یہ ہے کہ جب سیپ کے پیٹ میں کوئی ریت کا ذرہ چلا جاتا ہے تو اس پر لیس دار لعاب کی تہہ چڑھنا شروع ہو جاتی ہے اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ موتی کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جتنا زیادہ لیس دار مادہ چڑھتا ہے اتنا ہی بڑا موتی بنتا ہے۔ تو ان جاپانیوں نے چھوٹے چھوٹے سنگ ریزے سیپیوں میں داخل کر دیئے اور انہیں پانیوں میں چھوڑ دیا۔ مقررہ عرصے کے بعد نکال کر سیپیوں کو کھولا تو تمام کنکروں پر لعاب چڑھ گیا تھا اور وہ موتی بن چکے تھے، گول گول سب ایک برابر ناپ کے۔ اس بوڑھے جوہری نے بتایا کہ ایسے موتی کلچرڈ پرل کہلاتے ہیں اور یہ ان موتیوں کے مقابلہ میں کم قیمت کے ہوتے ہیں جو فطری عمل کے نتیجے میں بنتے ہیں۔ چناں چہ دوسرے دن جب وہ عرب تاجر آئے تو سیٹھ صاحب نے کہا بھائی یہ تو کلچرڈ پرل ہیں اور ان سے بہت کم قیمت پر وہ موتی

خرید لئے، سمجھو تقریباً کوڑیوں کے مول، اس کے بعد ان کو اصلی ظاہر کر کے کہیں اور بیچ دیا۔ اس طرح ان کا لاکھوں روپے کا نفع ہو گیا۔ اس پر سیٹھ جی نے خوش ہو کر ایک یاقوت اپنی تجوری میں سے نکال کر مجھ کو دکھایا اور کہا لو یہ دیکھو یہ لاجواب نگینہ ہے اور یہ ہم تم کو دیتے ہیں، یہ انعام ہے تمہاری دیانت اور کارکردگی کا۔ وہ یاقوت لے کر میں واپس اپنے قصبے آیا، سب سے ملا جلا، باپ کو کچھ روپے دیئے اور وہاں کے جو رئیس تھے ان کو وہ یاقوت دکھایا۔ یاقوت دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ میاں بفاتی ہمارا ریاستوں میں بہت آنا جانا ہوتا رہتا ہے، کابل کے امیر کے پاس بھی ہم ہو آئے ہیں اور وہاں بھی بہت جواہرات دیکھے، ہمیں شوق بھی بہت ہے ان کا، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ اس پانی کا اور اس رنگ ڈھنگ کا یاقوت ہم نے آج تک نہیں دیکھا، لاجواب نگینہ ہے یہ۔ انہوں نے وہ یاقوت خریدنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہمیرے پیچھے پڑ گئے کہ منہ مانگے دام لے لو۔ وہ یاقوت میں نے ان کی نذر کر دیا اور قیمت کے نام پر پیسہ کوڑی نہ وصول کیا کہ مجھے ان کے احسانات یاد تھے۔ ابّا افیم کی پنک میں پڑے رہتے تھے، گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا تو وہ خوان لگوا کر ہمارے یہاں بھجواتے تھے اور میں اسکول سے بھاگ کر ان کے باغوں میں آم چرانے جاتا تھا تو مجھے بلا کر بہت نصیحت سے کہا کرتے تھے کہ پڑھ لکھ کر کچھ کر لو، یونہی واہی تباہی پھرتے پھرو گے تو زندگی میں کچھ نہ کر پاؤ گے۔ تو وہ یاقوت میں نے ان کی نذر

کر دیا اور واپس بمبئی چلا آیا، سیٹھ جی کے پاس۔ وہیں کام کرتا رہا پتھروں کی مجھے ایسی پہچان ہو گئی تھی کہ میں کام کرتے کرتے فوراً جانچ لیتا تھا۔ قضائے الٰہی سے کرنا کیا ہوا کہ سیٹھ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اب وہاں میرے لئے کیا دھرا تھا۔ وہ تھے تو ان کے دم سے باپ کا جیسا سایہ تھا، وہ گئے تو یہ بھی گیا۔ ان کے لڑکوں میں سے ہوشنگ تو چاہتا تھا کہ میں دوکان پر اسی طرح کام کرتا رہوں مگر بہرام اُس وقت سے مجھ سے ناراض تھا جب سیٹھ جی نے یاقوت مجھے دیا تھا۔ میں ان دونوں لڑکوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے خادم ہیں، آپ کے باپ کا نمک کھایا ہے، ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے سبب سے آپ دونوں میں رنجش پیدا ہو چناں چہ ہم اب دوکان پر نہیں رہیں گے اور ہمیں سیٹھ صاحب اتنا کچھ دے گئے ہیں کہ ہماری زندگی بھر کو کافی ہے، ہاں ہم آپ کے خادم اسی طرح ہیں، جو خدمت ہمارے لائق۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ نہ دولت کی خواہش تھی نہ دنیا کی ہوس، ہر چیز سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ واپس اپنے قصبے میں جانا نہیں چاہتا تھا اور بمبئی کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ کچھ ایسی لَو لگی کہ مزاروں مزاروں گھومنے لگا، ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا، جہاں کہیں سُن پاتا کہ فلاں بزرگ ہیں ان کے پاس حاضری دیتا۔ بڑے بڑے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کیں۔ سادھوؤں، جوگیوں سے عقیدت ہو گئی، ان سے بہت فیض اُٹھایا۔ رفتہ رفتہ جوگ لے لیا اور گیروا پہننے لگا۔ ایک دفعہ میں

Scanned with CamScanner

کان پور میں تھا کہ جوگیوں کا ایک گروہ وہاں آیا۔ میں ان کے پاس پہنچا۔ ان کے جو گرو تھے وہ واقعی بہت پڑھے لکھے ذی علم شخص تھے، اور کسی مذہب سے تعصب نہیں تھا۔ کہتے تھے کہ سارے مذہب فی الاصل ایک ہیں۔ وہ نیکی، تفکر اور خیر کی پرستش کی تعلیم دیا کرتے تھے، چھوت چھات بالکل نہیں برتتے تھے، ہاں گوشت البتہ نہیں کھاتے تھے۔ میں ان کے پاس رہنے لگا اور ان کا چیلا ہو گیا۔ وہ لوگ تبت یا ترا پر تبت کو جانے والے تھے۔ میں نے سنا تو کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔ انہوں نے کہا کہ گرو جی سے پوچھ لیں، اگر وہ کہہ دیں تو ٹھیک۔ گرو جی نے آگیا دے دی۔ جوگی چلے تو ان کے ساتھ میں بھی اپنی جھولی جھنکاڑی اٹھائے چل کھڑا ہوا۔ جوگیوں کی سی وضع بنا کے انہی کے ساتھ ہو چلا۔ جنگلوں سے ہوتے ویرانوں سے گذرتے نالوں کو لانگھتے دریاؤں کو پھلانگتے چلتے چلتے بالآخر ہوتے ہوتے ہندوستان اور تبت کی سرحد پر واقع ترائیوں میں جا پہنچے۔ آپ نے تو کبھی ترائی دیکھی نہ ہوگی کہ ترائی ہوتی کیا چیز ہے۔ سبزہ ہریالی، پہاڑوں پر ہر طرف بیل بوٹے، رنگدار چڑیاں، شیروں کے ہونکنے کی آواز، چیتل چکارے نیل گائے اور جانے کیا کیا۔ جوگی جنگلی پھل پھلاری کھا پی کر گذارا کر لیتے تھے، مجھے ان چیزوں کی عادت نہیں تھی۔ مستقل بداحتیاطی سے میرا معدہ جو پہلے ہی کمزور ہو رہا تھا، ترائیوں میں پہنچ کر خراب ہو گیا اور مجھے اسہال ہونے لگا۔ آگے سفر کرنا ناممکن ہو گیا، دن میں

Scanned with CamScanner

کئی کئی بار جنگل جانا پڑتا تھا۔ پانچ دن جوگیوں نے میرا انتظار کیا کہ میری حالت ذرا اُنیس بیس ہو اور وہ مجھے ساتھ لے چلیں، بہتیری جنگلی بوٹیاں پیس پاس کر کھلائیں چٹائیں مگر میری حالت نہ سنبھلی۔ بالآخر میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ مجھے پیچھے چھوڑ کر سفر کر جائیں۔ جنگلی پتّے بچھا کر بستر سا بنا لیا، اس پر لیٹا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ اگلے دن صبح پیٹ میں بڑا بھاری مروڑ اُٹھا اور اجابت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک کونے میں کوہو لیا۔ قریب میں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جہاں بہت سے کنکر پتھر پڑے تھے۔ فراغت کے بعد استنجے کے لئے جو ایک پتھر اٹھایا تو دنگ رہ گیا۔ اب چونکہ میں جواہرات سے بہت شناسا تھا، پتھر الٹ پلٹ کر دیکھا تو ہیرا، اور چڑیا کے انڈے برابر۔ بس اسی وقت الٹا سیدھا وہاں سے اٹھا اور وہاں جو کنکر پتھر پڑے تھے انہیں ٹٹولا تو پتہ چلا کہ ہیرے بکھرے پڑے ہیں، ناتراشیدہ ہیں مگر پورا ذخیرہ ہے۔ میں نے کیا کام کرا، اپنی جھولی میں جو کچھ تھا، سب ہیں پھینک دیا اور جھولی کو ہیروں سے اٹا اٹ بھر لیا۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح ہندوستان کی سرحد میں گرتا پڑتا پہنچا اور ہوتا ہواتا واپس بمبئی چلا آیا۔ اب میں نے کیا کہ ناشروع کیا کہ ان ہیروں کو ترشواتا گیا۔ جھولی میں سے ایک ہیرا نکالتا، اسے ترشواتا اور چور بازار میں بیچ دیتا۔ ایک ایک ہیرا ان میں سے اپنے جوڑ کا ایک اکیلا، وضع میں لاثانی، اور قیمت میں اتنا کہ سمجھو پوری سلطنت کا خراج۔ بمبئی کے

Scanned with CamScanner

جوہریوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یونہی سلسلہ چلتا رہتا، ایک ایک کر کے میں بیچتا اور کھاتا رہتا تو عمر چین آرام سے کٹ جاتی لیکن مجھے شیطان نے انگلی دکھائی، سوچا کہ چار پانچ ہیرے اب کی مرتبہ اکٹھے بیچ دوں۔ دل میں لالچ سمایا کہ روپیہ ملے گا تو بمبئی میں عالی شان کوٹھی بنواؤں گا، ٹھاٹ باٹ سے رہوں گا اور اپنے قصبے والوں کو بلا کر دکھلاؤں کہ آؤ اور دیکھو کہ جسے تم سب نکھٹو کہتے تھے وہ تم سب سے زیادہ عیش عشرت میں رہتا ہے۔ چار پانچ ہیرے ایک ساتھ جو بکنے کو آئے تو بمبئی کے جوہریوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا کہ یہ ہیرے کہاں سے آئے ہیں، ایسے نایاب، چار سُو ان کی دھوم مچ گئی۔ قدر شناس انہیں ڈھونڈنے لگے، کھوجی ان کے کھوج میں لگ گئے، خوب دام چڑھے ان کے۔ شُدہ شُدہ یہ خبر انگریزی سرکار تک جا پہنچی کہ کوئی شخص ہے جو بمبئی کے چور بازار میں ہیرے لا لا کر بیچتا ہے۔ بمبئی کی خفیہ پولیس ٹوہ میں لگ گئی۔ پولیس کا نام جو بیچ میں آیا تو میں نے سارے ہیرے چھپا لیئے اور روپوش ہو گیا۔ بہت دن روپوش رہا، جتنا روپیہ کمایا تھا، سب کھا پی کے اُڑا دیا۔ روپے کی ضرورت پڑی تو میں نے یہ کیا کہ بازار سے چھوٹے نگینے مول لے آیا اور پٹڑی پر انہیں پھیلا کر بیٹھ گیا، بیچنے لگا۔ ان میں ایک دو اصلی ہیرے کے ٹکڑے ڈال دیتا۔ جو لوگ جواہرات کو جانتے تھے، جوہر شناس تھے، ان میں سے کوئی آتا اور نگینے دیکھتا تو وہ بات چیت کر کے اصلی ہیرا

خرید لے جاتا۔ سڑکوں پر بھاگتے دوڑتے ہجوم کو اندازہ ہی نہ ہوتا کہ سڑک کی پٹڑی پر ایک بوڑھا اصلی ہیرے کوڑیوں کے مول بیچ رہا ہے، اور انہیں خبر ہو بھی جاتی تو انہیں یقین نہ آتا بلکہ سمجھتے اس میں کوئی دھوکہ ہے۔ تو میں سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا چار چار آنے اصلی ہیرے بیچنے کے لئے۔ خفیہ پولیس میں ایک انسپکٹر تھے جن کو میں اس وقت سے پہچانتا تھا جب میں سیٹھ جی کی دوکان پر ملازم تھا، انہیں جواہرات کا بہت شوق تھا اور پرکھ بھی ایسی کہ کچھ نہ پوچھو۔ یہی انسپکٹر صاحب پہلے اس وقت ہیروں کی خبر سن کر تفتیش کرنے آئے تھے تو ان کا نام سن کر میں اپنی دوکان سمیٹ سماٹ کر چھپ گیا تھا۔ اب ایک دن فٹ پاتھ پر نگینے پھیلائے بیٹھا تھا کہ وہ میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور کہا کیوں میاں بفاتی آج کل خوب رتی چمکتی ہے۔ میں چونک گیا۔ وہ وہیں اُکڑوں بیٹھ گئے اور بولے کیا بیچتے ہو؟ میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ حضور مائی باپ کچھ دال دلیہ کر لیتا ہوں۔ انہوں نے پھر ڈپٹ کر پوچھا کہ ابے کیا بیچتا ہے۔ میں نے عرض کیا جھوٹے نگینے لے آتا ہوں اور دو دو آنے چار چار آنے بیچتا ہوں، اس میں دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے، روکھی سوکھی کھا کے شکر ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے سامنے پھیلے ہوئے نگینوں کو بغور دیکھا اور چن کر اصلی ہیرے کا ٹکڑا اٹھا لیا اور پوچھا کیوں یہ بھی چار آنے کا ہے؟ میں نے کہا جی حضور یہ بھی چار آنے کا ہے۔ انہوں نے ایک چونّی میرے ہاتھ پر رکھی اور ہیرے

کا دانہ اپنی جیب میں ڈال لیا، پھر مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھو تم مسلمان ہو، کم عمر ہو، تمہاری زندگی خراب ہو جائے گی، خفیہ پولیس تمہاری فکر میں ہے، تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم فوراً شہر چھوڑ جاؤ۔ تو صاحب میں نے اسی دن بمبئی چھوڑ دیا۔ وہ دن آج کا دن بمبئی کی صورت نہیں دیکھی، لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ بمبئی کی خفیہ پولیس کیا بلا ہے اسی لئے تو میں کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتاتا نہیں ہوں۔" بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا "ایسے معاملے میں کسی کا کیا اعتبار، کیا پتہ کون کیا نکلے۔ بس آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ بمبئی چھوڑ کر میں واپس اپنے قصبے چلا گیا، کافی عرصہ وہاں رہا۔ ایک دن جو سر میں سودا سمایا تو ترچناپلی جا پہنچا، وہاں کا ہیروں کا کام ہندوستان بھر میں مشہور ہے، سوچا کہ چند ہیرے بیچ ڈالوں گا اور پیسے اکٹھے کر کے دوبارہ اسی ترائی میں جاؤں گا اور اب کی بار خوب تیاری سے جاؤں، پہلے تو کچھ بھی نہ لا سکا، اس مرتبہ ڈھیر سارے ہیرے اٹھا لاؤں گا۔ بہت مصیبتیں اٹھاتا ہوا واپس تبت کی سرحد کی طرف آیا لیکن وہ ترائی نہ مل سکی۔ ایک مرتبہ ناکام ہو کر لوٹا، پھر دوسرا کے گیا، پھر تیسری دفعہ، بہت جنگلوں جنگلوں ڈھونڈا لیکن اس ترائی کو نہ ڈھونڈ پایا جس میں ہیرے ملے تھے۔ بہت سوچا کہ کیا کروں۔ خیال آیا کہ اگر تبت والوں کو بتاتا ہوں تو وہاں کا دلائی لامہ لے جائے گا، ہندوستان میں خبر کرتا ہوں تو انگریز چھین لیں گے، مجھے کیا

ملے گا۔ اس زمانے میں اٹلی اور ترکی کی لڑائی ہو رہی تھی طرابلس میں، مسلمانوں میں بہت جوش و خروش تھا اس بارے میں، تو سوچا کہ سارے ہیرے جمع کر کے ترکی والوں کو بھجوا دوں گا۔ میں خود رکھ کے کیا کرتا۔ اگر اس وقت وہ ہیرے میرے پاس ہوتے بھی تو میں ہیروں والا بوڑھا بھلا کہاں ان کی قدر و حفاظت کر سکتا تھا جیسے اچھا آدمی خدا کے بخشے ہوئے کسی انمول تحفے کی حفاظت نہیں کر سکتا اور نہ اُسے چھپا سکتا ہے۔ بہت ڈھونڈا، ہمالیہ کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگلوں کے بہت چکر لگائے، سارا علاقہ چھان مارا، لیکن وہ جگہ پھر نہ ملی۔ اسی چکر میں باقی ماندہ بچے کھچے ہیرے کوڑیوں کے بھاؤ بک گئے۔ یہ دھن ایسی سمائی کہ گھر بار مال اسباب نیلام ہو گیا۔ اس کہانی والے آدمی کی جیسی حالت ہو گئی جو آواز لگایا کرتا تھا "ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے"۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں چکر لگائے ہوں گے ترائیوں کے، مگر وہ جگہ ایک دفعہ مل کے پھر ایسی اوجھل ہوئی کہ دوبارہ اس کا پتہ نشان کچھ نہ ملا۔ ملک کا بٹوارہ ہو گیا، میں یہاں چلا آیا اور اب سودائی بنا پھرتا ہوں کہ ذرا کچھ روپیہ پیسہ جمع ہو تو اسی طرح جھولی جھنکاڑی کندھے پر ڈال کر لے جاؤں اور ہیرے ڈھونڈ نکالوں، پھر کیسہ بھر کر لاؤں۔ بس بھائی یہ بات ہے۔ اگر ان ہیروں میں سے کوئی باقی بچا ہوتا تو میں آپ کو دکھاتا کہ شہنشاہوں بادشاہوں کے لائق ہیرے تھے جو مجھے ملے تھے"۔ ذرا سانس

لوٹا، وہ رُکا، پھر اسی روانی سے بولنے لگا "ہوتے تو دکھاتا، اب تو ایک ہی دھن ہے، پھر وہیں جاؤں، نایاب لاجواب ہیرے....."

مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کی کہانی پر یقین کروں یا اسے اس کے ذہن کی اختراع سمجھوں۔ میں وہاں سے اٹھنے لگا تو لجاجت بھرے خوشامدانہ لہجے میں وہ مجھ سے کہنے لگا "میاں، ایک کڑک چائے پلواتے جاؤ، قسم سے بڑی طلب لگ رہی ہے۔"

ہیرا تو وہ نہ دکھا سکا مگر اس نے مجھے ہیرے جیسی کہانی دی اور میں یہ کہانی اپنے پاس نہیں رکھ رہا، آپ تک پہنچا رہا ہوں یہ ہیرے جیسی کہانی۔

(۱۹۷۹ء)

برقی کتب

Scanned with CamScanner

خوشبو کے سوداگر

"اس نے کہا میں قوتِ شامہ کی قبیل سے ہوں اور کوئی فن ایسا نہیں ہے جو سونگھنے کے احساس کی طرف رجوع کرتا ہو۔ فقط زندگی ہے ۔۔۔۔" "کیہیئرز"

آلبر کامو (۱۹۴۱ء)

ایک دفعہ چچا جان کا چھوٹا بیٹا عطر کی شیشی پی گیا۔ اب جو سانس بھی لے تو خوشبو میں بسا ہوا، منہ کھولے تو خوشبو کی لپٹیں اُٹھیں، پاس سے گذرے تو پورا کمرہ مہک جائے۔ ہوا یہ کہ وہ کھیلتے کھیلتے اُدھر جا نکلا جہاں صحن کے پاس برآمدے میں دادا ابا کا تخت بچھا ہوا ہے اور ان کا سارا سامان رکھا ہوا ہے۔ شیشیاں، ڈبیاں، ڈھکنے، کیس، کارٹن، پرزے، اوزار، رُکی ہوئی گھڑیاں، کلو کلاک، ناقابل مرمت گیجٹز، چٹرم پٹرم اور دوسری بہت ساری قطعاً بے مصرف مگر دلچسپ چیزیں ——— چونکہ بچوں کو ان چیزوں کے چھونے چھیڑنے سے مستقل منع کیا جاتا رہتا تھا اس لئے ان میں ممنوعہ اشیاء

کی سی کشش محسوس ہوتی تھی اور پُرانے بے مصرف سامان میں پنہاں حیرت و مسرت جو صرف بچّوں یا بوڑھوں کے امکان میں ہوتی ہے۔ اُس نے جو موقع دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے اور میدان صاف ہے تو تخت پر چڑھ بیٹھا، لگا اُلٹ پلٹ کرنے۔ اور تو کچھ ہاتھ نہیں لگا، ایک شیشی میں خس کا عطر رکھا ہوا تھا جو دادا ابّا نے قنّوج سے منگوایا تھا۔ خوشبو کے بہت رسیا تھے ہمارے دادا۔ اُس نے جو شیشی کو ٹٹولا ٹٹالا، کرسٹل جیسی جھلجھلاتی شیشی سنہرا ڈاٹ اور شیشے میں نازک اندام کمر کا جیسا کٹاؤ، کھول کر دیکھا بھالا، خوش بُو اچھی لگی، سمجھ میں خاک نہیں آیا، اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا منہ لگا کر شربت کی طرح گھونٹ بھر لیا۔ کڑوا جو لگا تو چھوڑ دیا اور رونے لگا۔ اس کے رونے کے ساتھ ساتھ تمام میں خوشبو پھیل گئی، اور وہ روئے بھی تو ہچکی کے ساتھ خوشبو کے گاڑھے گاڑھے مرغولے سے آئیں۔ پہلے تو اس کا مذاق بنا، دادا کہنے لگے کہ آج یہ خوشبو رچے گریہ کا نیا مضمون پیدا ہوا، مگر وہ بے چارا بچّہ خوشبو اُگلتا، آدمی سے مُشک بلاؤ بنا روئے جائے۔ اب کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کریں، پیٹ میں درد نہ ہو یا خوشبو دماغ پر نہ چڑھ جائے۔ آخر دادا ابّا کو یاد آیا کہ ان کے ایک واقف کار عبدالمغنی صاحب خوشبو ساز ہیں جن کی بندر روڈ پر دوکان ہے اُنہیں اس کا نسخہ پتہ ہوگا۔ خوشبو ساز کی تلاش میں مجھے بھیجا گیا، میں نے فوراً حامی بھر لی کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ پہلے

مجھے اس کی تمام محاضرات سنائیں گے۔

یہی ہُوا۔ ادھر بچّے نے رونا ذرا کم کیا، انہوں نے مسامرہ شروع کیا۔ "تمہیں پتہ ہے یہ جو عبدالمغنی خاں ہیں انہیں خوشبو کی اتنی عمدہ پہچان ہے کہ شاید ہی ہندوستان بھر میں کسی اور کو ہو۔ یہ بھی ایک خداداد صلاحیت ہے۔ قنوج میں عطر کا کاروبار تھا ان کا۔ وہیں حاجی مصطفیٰ خاں عطر فروش کا مشہور کارخانہ تھا جس کے منتظم تھے اختر علی صاحب، وہ مولانا احمد علیؒ صاحب سے کچھ عزیز داری بھی رکھتے تھے، ان کے توسط سے ہماری ان کی صاحب سلامت ہو گئی اور ہم بھی کئی دفعہ ان کے ساتھ عطر خریدنے گئے۔ اور یہ عطر خریدتے کس دھوم سے تھے وہ بھی سُنیئے۔۔۔۔" دادا ابّا ایک دفعہ قصّہ شروع کر دیں تو پھر آپ سُنے بغیر نہیں رہ سکتے جیسے کولرج کی نظم میں شادی کا مہمان بوڑھے ملاح کا قصّہ چھوڑ کر نہ جا سکا تھا۔ میں تو حیز ہمہ تن گوش بیٹھا تھا، میاں مُشک بو بھی رونا دھونا بھول کر آن براجے۔ "سب دوکانداروں کو اطلاع بھجوادی جاتی تھی کہ خان صاحب آنے والے ہیں، یہ آئے اور پہلی کوٹھی میں پہنچے۔ اب جس دوکاندار کو دیکھیئے ریشہ خطمی ہوا جا رہا ہے کہ آیئے خان صاحب میاں آیئے خاں صاحب میاں تشریف لایئے خاں صاحب میاں۔ اب خاں صاحب میاں نے پوچھا کہو بھئی لالہ کیا بنایا ہے۔ دوکاندار جواب دیتے حضور بنانے والی تو اس کی ذات ہے ہم تو جوہر کشید کر لیتے ہیں۔ اچھا کہو کیا تیار کیا ہے۔ حضور بروانے گئے تھے وہاں سے

Scanned with CamScanner

گلاب لائے ہیں اور موسیٰ نگر سے خس منگوایا ہے۔ اچھا بھئی دکھاؤ۔
تو خان صاحب کے دیکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ان کا نوکر روئی کی دو تین
پھُریریاں بنا کر خاں صاحب کے ہاتھ میں دے دیتا تھا اور جتنا عطر
ہوتا تھا وہ ایک گگرے میں لاکر ان کے سامنے رکھا جاتا تھا خاں صاحب
اس میں پھُریری چھُوا لیتے اور ناک کے پاس لاکر سونگھتے۔ اس سے
ان کو سارے عیب صواب معلوم ہو جاتے۔ اب اگر عطر ان کی سمجھ میں
آگیا اور انہوں نے اسے خریدنے کا ارادہ کر لیا تو گگرا وہیں رکھا رہے گا
کوٹھی کے اندر نہیں جائے گا، جب وہ کوٹھی سے چلیں گے تو کوٹھی کا ملازم
گگرا سر پر رکھے ان کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا۔ اس طرح تمام کوٹھیوں
سے مال ملاحظہ کرتے ہوئے وہ آتے تو کئی ساہوکاروں کے ملازم ان
کے پیچھے کُپّے اور گگرے لئے ہوئے ہوتے۔ اب ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ
مولوی اختر علی کو بتا دیتے تھے کہ یہ اس بھاؤ کا اور یہ اس بھاؤ کا،
اور خود اندر جا کر لیٹ رہتے۔ مولوی صاحب کا جی چاہا تو انہوں نے
اسی وقت تُلوا لیا اور اس کے پرچے بنا کر ملازموں کو دے دئے
اور نہیں جی چاہا تو کہہ دیا فلاں وقت آنا تب تولیں گے۔۔۔۔۔۔
وہاں کے دوکان دار بڑا اعزاز سمجھتے تھے کہ خاں صاحب ان کے
یہاں کا عطر لے جائیں اور آپس میں بڑی رقابت رہتی تھی کہ کس کے
یہاں کے زیادہ سے زیادہ عطر خاں صاحب کی پسند پر پورے
اُترتے ہیں۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ خاں صاحب دیبی پرشاد کی

Scanned with CamScanner

دوکان پر گئے۔ دیبی پرشاد تھا نہیں، کہیں گیا ہوا ہو گا، اس کے لڑکے نے کیا کام کرا کہ ایک پھُریری دو تین کنڑوں میں ڈبو کر لا کے خاں صاحب کے ہاتھ میں دے دی اور کہا کہ دیکھیئے خاں صاحب ہم نے یہ عطر مجموعہ بنایا ہے۔ خاں صاحب نے سونگھا اور اس بری طرح اسے گھور کر دیکھا کیوں بے ہم تیرے باپ کی عمروں کے ہیں اور تو ہم سے چُہل کرتا ہے، اچھا تو سُن لے دیکھ اس میں یہ عطر ہے اور اس میں یہ عطر ہے، یہ اتنا بھاری ہے یہ اتنا ہلکا ہے یہ ایسا ہے یہ ویسا ہے۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے ان کی طرف دیکھنے لگا کہ واقعی خاں صاحب جیسا آپ کو سُنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔

"وہ تو متاثر ہو گیا مگر خاں صاحب کچھ ایسے بد دل ہو گئے کہ دنیا سے اعتبار اٹھ گیا کل کے چھوکرے ہمارے شاہہ کا امتحان لینے لگے ہیں۔ اس کے بعد عطر کی آڑھت کا کام چھوڑ دیا اور خود عطر بنانے لگے۔ آئلی حنا بنانے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ قنوج کے جتنے تاجر تھے وہ سب آئلی حنا انہیں سے خریدتے تھے اور تمباکو بنانے والے ٹائکٹ صابن بنانے والے مَنوں کے حساب سے خرید کر لے جاتے تھے۔

ایک دفعہ ہم ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا نوکر بتانے آیا چین سے کچھ تتاری تاجر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا اندر بھیج دو۔ چپٹے چہرے کھنچی کھنچی آنکھیں، وہ تاجر مشک نافے بیچنے کو لے کر آئے تھے۔ خاں صاحب سے کہنے لگے کہ یہ مشکِ ناب ہے اور ہم بیچنے کو لائے تھے

آپ کا شہرہ سنا تو کہیں اور لے جانے کے بجائے سیدھے آپ ہی کے پاس آگئے کہ آپ اس کی صحیح قدر پہچانیں گے۔ خاں صاحب نے وہ نافے دیکھے، ایک ایک نافہ اٹھا کے سونگھنا شروع کیا۔ کچھ نافے ایک طرف رکھے کچھ نافے دوسری طرف۔ دو ڈھیریاں بنانے کے بعد بولے کہ دیکھو یہ نافے جو ادھر رکھے ہیں وہ ہم نے خرید لیئے ہیں اور جو نافے ادھر رکھے ہیں وہ تم اپنے اٹھا لے جاؤ۔ پھر بولے کا روبار کی بات کرو، کس حساب دو گے۔ تاجر تو بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ انہوں نے قیمت سے زیادہ دام دے کر انہیں چلتا کیا۔ ہم نے بھی ایک نافہ اٹھا کر دیکھا، عجیب سا تھا کھرنڈ جیسا، مرونڈا سا، میل بھرا سوکھا ہوا، ایک نافہ ادھر سے اٹھا کر سونگھا ایک ادھر سے لے کر۔ ہماری سمجھ میں تو کوئی فرق آیا نہیں، پوچھا کہ خاں صاحب ہمیں تو دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مسکرائے اور بولے اچھا ہم آپ کو ابھی بتاتے ہیں۔ نوکر سے کہا دو گلاسوں میں پانی لے آؤ۔ نوکر نے پانی لا کے رکھ دیا۔ خاں صاحب نے ایک نافہ ان میں سے اُٹھایا جو انہوں نے خریدے تھے اور اٹھا کر پانی میں ڈال دیا، دوسرا نافہ ان نافوں سے لیا جنہیں خریدنے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور وہ دوسرے گلاس میں ڈال دیا۔ ڈال کے بیٹھ گئے اور ہم سے غپ شپ کرتے رہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد بولے اب دونوں گلاسوں کو اٹھا کر سونگھیئے۔ ہم نے جو اٹھا کر سونگھا تو جس گلاس میں ان کا خریدا ہوا

نافہ پڑا تھا اس میں خوش بو مہک رہی تھی اور دوسرے گلاس کی خوشبو اُڑ چکی تھی اور پہلے والے گلاس کا پانی جو چھڑکا تو ساری فضا مشک بیز ہو گئی ------ مگر تم یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو تم سے تو ان کی دوکان ڈھونڈنے کو کہا تھا۔"

تو میں ان کے پاس جانے کے لئے نکلا مگر ان کی دوکان ڈھونڈنا بھی میرے لئے اُڑی خوشبو کو کھوجنا ہو گیا۔ بہت تلاش کرنے کے بعد تو وہ بازار ملا جس میں ان کی دوکان تھی۔ جامع مسجد عیدگاہ کے برابر جہاں ایک پتلی سی گلی بندر روڈ پر نکلتی ہے وہاں لنکا کی چائے کا بڑا سا اشتہاری بورڈ نصب ہے جو پردیس کے عجائبات کا بُلاوا بنا کھڑا ہے۔ یہاں سے کیبن، اسٹال اور چھوٹی بڑی نیم پختہ دوکانوں کا ایک سلسلہ ہے جو ایک دوسرے سے جُڑے ریل کے ڈبّوں کی طرح دوڑتا ہوا تھیوسوفیکل ہال اور اس کے مقابل ریڈیو پاکستان کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس تک جا کر ادھر ختم ہوتا ہے جہاں کتبے بنانے والے دن بھر بیٹھے بیٹھے نازک ہتھوڑیوں اور چھینیوں سے سفید پتھر کی سِلوں پر نازک حروف و نقوش کندہ کرتے رہتے ہیں۔ سامان سے لدا لدا بھری دوکانیں اکثر اپنی حدود سے تجاوز کر کے سامنے فٹ پاتھ تک بڑھ آئی ہیں۔ کچھ نے آگے بانس لگا کر سائبان بنا لیئے ہیں اور کچھ نے یہ تکلّف بھی ضروری نہیں سمجھا۔ گذرنے والوں کو المونیم کے برتنوں اور ریگزین کے ڈھیر بستوں سے بچ کر گذرنا پڑتا

ہے ورنہ ذرا پہلو سنبھالنے کی کوشش کی ہیں اِدھر سے اُدھر ہوئے اور برتنوں کا انبار چھن چھناتے ہوئے اڑا اڑا دھم کر کے نیچے، پھر فرش پر بجتے ہوئے بھگونوں کے ڈھکنے اور تھالیاں دیر تک دوکاندار کی گالیوں پر تال دے دے کر رقص کرتی رہیں گی۔ دوکانوں میں سامان کی تلے اوپری، خریداروں کا بھیڑ بھڑ کا، ہجوم کی حرکتِ مسلسل جس کا تعلق کسی ایک مرئی جسم سے نہیں بنتا لیکن جو نبض کی طرح رواں دواں دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ گرمی، شور، چکر کھاتے ہوئے رنگ اور مجھے اس دوکان کی تلاش۔ ہر چیز کی دوکانیں مل رہی تھیں، نہیں تھا تو اس دوکان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ کپڑے کی دوکانیں، دوکانیں جن میں المونیم اور تانبے کے برتنوں کے علاوہ لالٹینیں، اسٹوو، ٹین کے بکس، صندوق اور اسی نوعیت کا سامان بھرا ہوا ہے، اس کے بعد جہاں یہ اشتہار لگا ہوا ہے کہ "ملٹن اندھا کیوں ہو گیا تھا؟ اس لئے کہ اس زمانے میں ہمارا چشمہ ایجاد نہیں ہوا تھا، تشریف لائیے ملٹن آپٹیکو کمپنی ------" وہاں عینک کی دوکانیں ہیں جن میں آلۂ قوتِ سماعت، شیشے سے خالی فریم اور کمانیاں اس وحشت سے راہگیروں کو گھورتے ہیں جیسے چہرے سے نکلی آنکھیں۔ آگے سُرمے منجن کی مشہور دوکان ہے جس کے اوپر حیرت انگیز شرطیہ علاج کے دعوے نیلے رنگ میں چمچما رہے ہیں اور اس سے آگے عطر تیل خوشبو کی دوکانیں ہیں جن میں دینی کُتب اور آلاتِ جراحی کی دوکانیں

متحد الخیال اُمور کی طرح گھل مل گئی ہیں۔ اتنی ساری دوکانوں میں آکر میں بھرے میلے میں کھوئے بچّے کی طرح پریشان تھا کہ کس سرے سے ڈھونڈنا شروع کروں۔ اس دوکان کا تو کوئی سُراغ نہ مل رہا تھا البتّہ میری ناک نے، مصوّر کی آنکھ اور موسیقار کے کان کی طرح کام کرتے ہوئے کہانی کی بُو سونگھ لی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ عمر سے لمبی ان سڑکوں پر بے مہر دوپہریں اور بے امان شامیں ننگے پاؤں کھلے سر پھرتی ہیں کہ کوئی ان کی اُداسیاں اپنے سر لے اور اَن کہی کہانیاں اپنے مصنّفوں کی تلاش میں بے نقاب بے حجاب پھرتی ہیں، بھیڑ میں کندھے سے کندھا ٹکرا جاتی ہیں، کبھی کہنی مار دیتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے چلیں۔ دو ایک کہانیوں نے مجھے اشارے سے بلایا کہ آؤ تمہارے شانوں پہ کہانی کی زلفیں پھیلا لیں، مگر میں تو خوشبو ساز کی تلاش میں تھا۔ کہانیوں کے تانے بانے سے نکلا تو مجھے وہ دوکان نظر آئی۔ دو بڑی دوکانوں کے بیچ میں دُبکی ہوئی، گاہکوں کے ہجوم سے خالی، نہ اس پر کوئی اشتہار تھا نہ رونق۔ برابر کی دو کانوں میں وہ تمام مال بھرا ہوا تھا کریم پوڈر صابن دانیاں کنگھے موزے بنیان قینچیاں اٹرم سٹرم اور دوسری اشیائے صرف جنہوں نے ماس پروڈکشن کے اس دور میں مادہ پرست عام آدمی کے لئے زندگی کے معنی بدل دیئے ہیں۔ سامان سے بھری دوکانوں کے بیچ میں وہ اکیلی دوکان کھوئی ہوئی لگ رہی تھی جیسے

اردگرد کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر رہ گئی ہو۔

میں نے دوکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ کٹ گلاس کی خوبصورت شیشیوں میں عطر اور رنگین روغنی کاغذ میں لپٹی بوتلوں میں تیل سے الماریاں بھری ہوئی تھیں۔ سوکھے چھوارے جیسا چُرمُرایا ہوا دوکاندار بیٹھا حنا سے رنگی لال بھبھو کا داڑھی میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ چہرے سے عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ تیس سال سے ساٹھ سال کی کون سی مدت پر پہنچ کر وقت اس کے چہرے پہ ایک لامتناہی و ابدی لمحۂ حاضر میں رک گیا ہے۔ البتہ سارے جسم پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں جو شربتی انگرکھے میں سوکھی چھاتیوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ مہندی سے رنگے بال، مچی مچی آنکھیں جن سے پانی بہہ رہا تھا اور چیچپا کر بند ہوئی جا رہی تھیں، ناک اتنی لمبی جیسے اینٹینا اور چہرے پہ لاسلکی کے ریسیپٹر کی طرح چھائی ہوئی، زبان پان کی پیک سے کچے گوشت کی طرح لال اور دانتوں کا چونا کتھے میں اتنا گہرا رنگا ہوا جیسے آتش فشانی لاوے کے بہاؤ میں آدھی ڈوبی آدھی اُبھری چٹانیں۔ میں نے جا کر بتایا کہ کس مقصد سے آیا ہوں تو بڑی نخوت سے کہنے لگے "برخوردار کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے؟ خوشبو سے بھی کسی کو نقصان ہوا ہے؟" جب میں نے بتایا کہ مجھے کس نے بھیجا ہے تو فوراً گلے لگا لیا، اور بولے "اخاہ میاں تم تو ہمارے لئے عطرِ خبر بن کر آئے ہو۔" اور پیپرمنٹ کی گولیاں چوسنے کو دیں۔ تین ٹانگوں والے لمبے

Scanned with CamScanner

سے ایک اسٹول پر مجھے بٹھا دیا اور لگے اپنی باتیں سُنانے۔ "جب سے میں لوٹ کر آیا ہوں احباب سے ملاقات ہی چھوٹ گئی۔ تمہارے دادا سے بھی عرصہ ہو گیا ملے ہوئے۔ کچھ خبر نہیں کہ کون کس حال میں ہے؟"

"آپ کہیں باہر چلے گئے تھے؟" میں نے اخلاقاً پوچھا، ان کے پاس سے پان تمباکو کا بھبھکا اُٹھ رہا تھا اور پوری دوکان میں مختلف بُوئیں بسی ہوئی تھیں، تیل میں چکٹے ہوئے سر کی بھبھک، میٹھے تیل کی باس جو رکھے رکھے چیراہندا ہو گیا ہو، باسی پھولوں کی نیم دلانہ مری مری مہک، سڑی ہوئی کھٹاس اور تازہ عطر کی اتنی تیز خوشبو کہ سر میں درد کر دے۔

"ہاں میں لندن میں تھا۔ کافی عرصہ وہاں گذارا۔ انگریز کے زوال کا منظر دیکھتے دیکھتے جی اچاٹ ہو گیا تو واپس آ گیا۔ کاروبار تھا میرا وہاں پر۔ بہن بھائی آل اولاد کا ٹنٹا تو تھا نہیں، دمِ نقد تھا، بہتا بہاتا چلا گیا تھا۔ باپ میرے قنوج کے عطر فروش تھے مگر دوکان بڑھا رکھی تھی۔ قنوج کے قلعے میں جا کر ملبہ کھکھوڑتے تھے اور اس میں سے اکثر قیمتی چیزیں مل جاتی تھیں وہ بیچ لیتے تھے۔ اکثر برسات میں بارش کے بعد قلعے سے بہہ کر ملبہ نیچے آتا اس میں سے کچھ مل جاتا۔ ماں آرمینی یہودن تھیں ـــــ۔" انہوں نے اپنی لمبی ناک کھجاتے ہوئے کہا "ان کے خاندان والے بمبئی میں آباد ہو گئے تھے۔ قنوج میں عطر کی دوکان چھوڑ کر میں ان کے پاس چلا گیا، انہوں نے مجھے برسلز بھجوا دیا،

Scanned with CamScanner

وہاں سے میں لندن چلا آیا۔ لندن میں ایک مسٹر ٹائیر سیاس سے، جو سمرنا کے تاجر تھے، یارانہ گٹھ گیا، ان کے ساتھ جیر ونشن اینڈ کمپنی میں نوکری کرلی۔ کافی عرصے وہاں رہا۔ قضائے کار ایک فونیقی ملاح ڈوب گیا، اس کے بعد سے کمپنی پر ساڑھ ستی آگئی، ساکھ ختم ہوگئی کاروبار بیٹھ گیا، سو ٹیٹی صاحب اور ان کی معشوقہ نے کمپنی کے حصص خرید لئے۔ ان کی دن رات کی ہُو حَق اور بھی بھٹی سے بے زار ہو کر میں نے دھرا استعفیٰ اور یہاں چلا آیا۔ اب یہاں دوکان کرتا ہوں چاہے خریدار آئیں یا نہ آئیں۔"

"گاہک کم ہوں تو آپ کی دوکان کیسے چلتی ہے؟"

"ہم ان کے محتاج نہیں ہیں، خوشبو بیچنے والے تو بہت سے ہیں جو ظاہری چمک دمک سے گاہکوں کو متاثر کر لیتے ہیں۔ لوگ خریدتے بھی ایسوں ہی سے ہیں۔ لیکن ہمیشہ دو چار اصلی سوداگر بھی ہوتے ہیں۔ اور جو عطر شناس ہوتے ہیں وہ ان کی دوکان کو بند نہیں ہونے دیتے۔ سنو ایک واقعہ تمہیں سناؤں۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں کلکتے جا رہا تھا، میرے کارخانے کے منتظم صاحب بھی ساتھ تھے، تو میں نے سوچا کہ راستے میں مرشدآباد پڑتا ہے موقع ملے تو وہاں کے نواب صاحب کو کچھ عطر فروخت کریں، نوابین تو ہوتے ہی ہیں عطر کے قدردان، اور اس طور ہمیں بھی کچھ منافع ہو۔ چناں چہ وہاں جاکر سرائے میں اُترے۔ بھٹیاری سے کہا کہ ہمارے لئے کھانا پکا دو۔

کہنے لگی کہ نواب صاحب کا حکم ہے جتنے مسافر شہر میں آئیں اور سرائے میں ٹھہریں تین دن تک کھانا اُن کو ہماری سرکار سے دیا جائے تو میاں آپ کھانا پکوا کر کیا کیجیئے گا۔ ہم نے جواب دیا ہم کوئی محتاج ہیں، بھک منگے ہیں جو نواب صاحب کا کھانا کھائیں، ہمیں نواب سے کیا مطلب۔ دو دو پیسے کے دو تیتر منگوا کر بھنوا لئے اور وہ ہم نے کھائے۔ شام ہوئی تو پھر بھٹیاری نے کہا کھانا پکوا کر کیا کیجیئے گا، مگر ہم نہ مانے۔ اس سے ایک لمبی سی جھاڑو مانگ کر لے گئے اور سوکھے پتے بہت سے اکٹھا کر لائے اور ان میں آلو بھلس کر کھائے۔ اگلے دن سرائے میں نواب صاحب کا چوبدار پوچھتا ہوا آیا کہ وہ کون مسافر ہیں جنہوں نے نواب صاحب کا کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ بھٹیاری نے ہماری طرف اشارہ کر کے بتا دیا۔ چوب دار ہمارے پاس آیا کہ نواب صاحب نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ ہم تو خدا سے یہ چاہتے تھے۔ چوب دار کے ساتھ نواب کی حضوری میں پہنچے۔ دیکھا کہ ایک چوکا تختوں کا بچھا ہے اس پر مسند لگی ہے اور نواب صاحب تشریف فرما ہیں۔ مٹھو سا بنے بیٹھے تھے اور آدمی کے بجائے گاؤ تکیہ معلوم ہو رہے تھے۔ چاروں طرف حاشیہ بردار اور مصاحبین بیٹھے ہیں۔ سب کے سامنے ایک گلاس پانی کا رکھا ہے، چینی کی پیالی دھری ہے، ایک ڈبیہ کھلی ہے، ایک تشتری میں کچھ مٹھائی اور بالائی رکھی ہے، ایک ایک حقہ رکھا ہے اور ایک اُگال دان۔ نواب صاحب کو تسلیمات

بجا لا کر ہم بیٹھ گئے، اور نوکروں نے ہم دونوں کے سامنے بھی وہ اسباب جہالت لا کے رکھ دیا۔ ہم نے ذرا دیکھا بھالا تو نواب صاحب بولے بسم اللہ بسم اللہ یہ کوئی سرائے کا کھانا تھوڑی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ سب بیٹھے افیم گھول رہے ہیں تو ہم نے مولوی صاحب کو اشارہ کیا کہ تم بھی گھولو اور خود بھی گھولنا شروع کیا۔ جب دیکھا کہ یہ لوگ عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں تو آنکھ بچا کر افیم اگال دان میں پلٹ دی اور جو تشتری میں رکھا تھا اس سے منہ میٹھا کر لیا۔ نواب صاحب پنک سے چونکے اور ان کی آنکھیں کھلیں تو پوچھنے لگے جناب کا تعلق کس طرف ہے۔ عرض کیا کہ ہم تجارت پیشہ ہیں، عطر بیچتے ہیں۔ ایک مصاحب بولے ہمارے نواب صاحب سے بڑھ کر عطر کا کون قدردان پا رکھ ہو گا۔ نواب صاحب بولے ہاں ہاں اپنا مال دکھاؤ۔ ہم نے کہا بہت بہتر ابھی لیجیے۔ مولوی صاحب سے کہا جائیے سرائے میں سے ہمارا صندوقچہ لے آئیے۔ وہ گئے اور لے آئے۔ نواب صاحب نے اپنا رومال دیا اور ہم سے کہا کہ چار عطر اپنے خاص جو سب سے عمدہ ہوں اس رومال کے چار کونوں پر لگا دو اور ان کے دام لکھ دو۔ ہم نے ایک ایک کونے پر ایک ایک عطر لگا دیا اور دام بھی لکھ دیئے، اس التزام کے بعد کہ اگر عطر چار روپے تولہ کا ہے تو چار کی جگہ سولہ روپے لکھ دیئے، یعنی سمجھو کہ ایک ایک کے چار لگائے۔ نواب صاحب نے کہا اچھا آپ رومال صندقچے میں بند کر کے، اس پر تالا لگا کر یہاں رکھ دیجیے،

Scanned with CamScanner

خریدنے کی بات کل ہوگی۔ ہم اسے وہاں چھوڑ کر چلے آئے۔ دوسرے دن جو گئے تو نواب صاحب نے اس رومال کو ملاحظہ فرمایا، عطر سونگھنے دام دیکھے اور کہنے لگے بس اتنی ہی قیمت کے عطر ہیں آپ کے؟ اب ہم چکرائے کہ بڑی حماقت کر دی ہم نے جو ان کے دام بہت زیادہ نہیں بتائے۔ نواب صاحب نے ایک نوکر کو حکم دیا کہ ہماری بقچی لاؤ۔ نوکر لے کر آیا۔ انہوں نے اس کو کھولا اور اس میں سے ایک کنٹر نکال کر دکھایا کہ یہ پارسال ہمیں لالہ آسو توش کے کارخانے نے فروخت کیا تھا۔ ہم نے جو لے کر سونگھا تو نہایت واہیات۔ کہا کہ واہ صاحب کیا کہنے اس کے، اپنی مثال آپ ہے، اور کیوں نہ ہو حضور کے سے عطر شناس کی پسند ہے۔ نواب صاحب پھول گئے کہ یہ ہوتی ہے خوشبو۔ ہم نے سوچا کہ کچھ کارگذاری کرنا چاہیئے تو ہم نے کہا کہ حضور ایک چیز ہے ہمارے پاس جو ہم آپ کو دکھائے دیتے ہیں مگر ہے پرائی امانت۔ تو ہمارے پاس ایک شیشی بھری ہوئی تھی جو ہمارے معیار کا صحیح عطر بن نہیں پایا تھا۔ تو ہم نے وہ کٹ گلاس کے کنٹر میں ڈالا اور اس پر سنہری ٹوٹل لگا، گوٹے سے باندھ کر تیار کیا۔ بڑی نفاست سے اسے نکالا اور نواب صاحب سے کہا حضور ملاحظہ فرمائیے، مگر یہ بیچنے کے لئے نہیں ہے۔ نواب صاحب نے سونگھا اور فرمایا دیکھو اب تم نے ہمارے مطلب کی چیز دکھائی، مگر یہ کیا بات کی بیچنے کے لئے نہیں ہے۔ ہم نے کہا کہ حضور بات یہ ہے کہ کلکتے کی ایک بائی جی

Scanned with CamScanner

کے لئے وہاں کے سیٹھ نے ہم سے بنوایا ہے، اور چھ مہینے میں تو یہ جاکر تیار ہوا ہے، ان کی امانت ہے اور ان کے لئے یہ لے جا رہا ہوں۔ وہ بولے نہیں یہ تو ہم لیں گے۔ ہم نے کہا حضور اگر آپ کی نظر میں آگیا ہے تو ہماری قدر افزائی ہے، لیکن ایسا کیجیئے کہ اس کا آدھا ہمیں دے دیجیئے اور آدھا آپ لے لیں۔ بولے نوابوں کی پسند کی ہوئی چیز کے لئے ایک معمولی سیٹھ کا کیا سوال، اس میں سے ایک ماشہ نہیں ملے گا اس کی قیمت بتاؤ۔ ہم نے بہت ہچر مچر کی، آخر ہزار روپے تولہ دام بتائے۔ نواب صاحب نے اسی وقت پیسے منگوا دیئے اور کنٹر اپنے قبضے میں کر لیا۔ اگلے دن ہم نے اپنا سامان باندھا اور وہاں سے سفر کا قصد کیا۔ جانے سے پہلے نواب صاحب کے رخصتی سلام کو گئے تو وہ فرمانے لگے میاں سوداگر ایک بات تو بتاؤ، ہم نے کہا حضور۔ بولے کہ یہ کیا بات ہے اس عطر میں آخیر میں کنڈے اُپلے کی جھجک آتی ہے۔ ہم متعجب رہ گئے۔ مولوی صاحب تو سیدھے آدمی تھے بولے واللہ کیا پہچان ہے، حضور بات یہ ہوئی کہ ایک دن بھٹی خانے میں لکڑی ختم ہو گئی تو نوکر نے دیگ کے نیچے کنڈے جلا دیئے، اس لٹھ گنوار کو کیا معلوم تھا کہ عطر آپ سے عالی دماغ کے حضور پیش ہو گا مگر حضور اوروں میں ایسی نزاکت کہاں قربان جاؤں حضور کے دماغ کے، میں نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ عرض کیا حضور بات یہ ہے کہ ناک جو سونگھنے کی عادی ہوتی ہے بو بھی ویسی

Scanned with CamScanner

آتی ہے۔ یہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا، کنٹر ان سے لے لیا، اس میں کا سارا عطر ان کے سامنے فرش پر الٹ دیا۔ جیب سے اس کے دام نکال کر وہیں ان کے سامنے ڈال دیئے اور اپنا تاشہ باجا باندھ کر رخصت ہو لئے۔

تو یہ ہے میاں" انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں کئی سوال مچل اٹھے تھے اور میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ میری بات کا اندازہ لگا کر وہ بولے

"یہ مذاق عام نہیں ہے۔ لوگ ان نزاکتوں کو سمجھ نہیں پاتے اور اشتہار بازی کے بہکائے میں آکر نقلی چیزیں خریدتے رہیں گے۔ جو ان نوادرات کو سمجھتے ہیں اور ان کی قدر جانتے ہیں وہ انہی کی یگانگت کی جستجو میں رہتے ہیں۔ خوشبو کی یہ دوکان انہی اہلِ ذوق کے لئے ہے"

الماریوں میں سجے عطر اور تیل کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا، اور ان کا یہ جواب میرے ذہن میں یوں بیٹھ گیا جیسے کسی درویش کی سنائی ہوئی صوفیانہ حکایت کا نکتہ۔

(۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

رات کی رانی

گرمیوں کی سہانی شاموں میں باغ پر خوشبو افسوں بن کے چھانے لگتی ، پُر فضا باغ کے گھنیرے ہریاول میں رینگتی ہوئی خاموشی دبے پاؤں چلنے لگتی ، سنولاتی ہوئی شام کی دھیمی آہٹ پھولوں کی تازگی ، آم کے درختوں کی مہک اور گھاس کی خُنکی بوجھل فضا کے اُمس میں گھل مل جاتی ـــــ ایسے میں وہ پھول سی کھِلی ہوئی معلوم ہوتی ، گرمی کے پھولوں اور مون سون کے موسم جیسی لڑکی ، گرمیوں کی بوجھل خوشبودار لمبی گہری راتوں جیسی لڑکی ، جس میں بہار کا موسم آہستہ آہستہ سرایت کرتا جا رہا تھا ، جیسے ہیرے بھرے درختوں میں رس اندر ہی اندر نامحسوس طور پر نفوذ کر جاتا ہے۔ لگتا تھا کہ ایک صبح اٹھے گی تو پھولوں سے ڈھکی ہوگی۔

شام ڈھلے اندھیروں میں گھلاوٹ آجاتی ، دن بھر کی پسیجتی ہوئی تپش تحلیل ہونے لگتی اور زمین سے گرمی بھپارے کی طرح اٹھتی جیسے مٹی گیلے بھبھکتے ہوئے سانس لے رہی ہو : لہو کی بوٹی بنا

سورج پیڑوں کی بے طرح بڑھی نچلی شاخوں میں اُلجھے الجھے پرانی حویلی کے رہے سہے ڈھیر پہ پُرشوکت طلا کاری کرتا جاتا جو دھوپ کے ساتھ اُترتے ہوئے اپنے پیچھے دیوار کی شفاف سطح پر تپش کے بعد کی ٹھنڈک اور اَدھ کھلی کلیوں کی رنگت چھوڑتی جاتی۔ سرِ شام کے چراغوں کی پھیکی جھلملاہٹ کا یہ وقت خوشبو کا وقت تھا۔ لگتا تھا خوشبو اندھیرے کی منتظر بیٹھی رہتی ہے کہ ادھر رات اپنی زلفیں چٹکائے ادھر خوشبو جھومتی اُٹھے اور مستی میں چھا جائے۔ دن بھر پھول شاخوں میں چپ چاپ ٹنگے رہتے، خوشبو کو اپنے گُم سُم سینوں کی گہرائی میں راز کی طرح دبائے ہوئے، ادھر رات آئی اور پھولوں کا بھید کھُلا۔ خوشبو اُمنڈنے لگتی۔ جوں جوں دن گھٹتا جاتا اور رات بڑھتی جاتی، خوشبو جاگتی، پھیلتی جاتی جیسے اپنی ہی وارفتگی میں بے خود ہو کر بے حجاب ہو رہی ہے، کھُل رہی ہے، لہراتی جا رہی ہے، اور جب رات بھیگ چکی ہوتی تو اس وقت خوشبو اپنے پورے شباب پر ہوتی، سارا باغ مہک رہا ہوتا۔۔۔۔۔

وہ جب سونے لیٹتی تو سرہانے کی کھڑکی اس پر مہکتے اندھیروں کا باب کھول دیتی۔ رات کی رانی بھینی بھینی خوشبو کا تازہ دم جھونکا بن کر ہوا میں گھُلی ہوئی اس کی طرف آتی۔ اندھیرے میں ڈوبے باغ میں اِکّا دُکّا تاروں کی ٹمٹماہٹ اور سوکھے پتّوں کی چُرمُر، نیند میں غافل ٹہنیوں میں ہوا کا خفیف ارتعاش، دبیز سیاہی میں

ملبوس پیڑوں کے مہیب سائے دیوار پر پھیل پڑتے اور آسیب کی طرح ڈولنے لگتے۔ اس اندھیرے میں خوشبو چڑھتی۔ بہت ہلکے جھونکے سے شروع ہوتی، ہوا میں اُڑا اُڑا خوش گوار سا ایک شائبہ، تازگی کا ایک احساس جو نرم لمس کی طرح چھوتا ہوا نکل جاتا، نوزائیدہ بچے کے سانس کی طرح جو ابھی بھیڑا نہ ہو، دھیمی دھیمی آنچ کی طرح جو پور پور میں سنسناہٹ جگاتی چلی جاتی ہے، دھیرے دھیرے لَو بڑھنے لگتی، بھڑک کر شعلہ بن جاتی، اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتی، بند کمرے میں شعلگی اور حرارت کے ابخرات کی طرح۔ تیز میٹھی مہکتی خوشبو اس کی مسہری کی طرف بڑھی آتی اور اس پر بادل بن کر چھا جاتی۔ نیند میں ڈوبی آنکھوں کو کچھ نظر نہ آتا، غنودگی میں کھوئے جسم پہ سرسراہٹیں ہونے لگتیں، خوشبو پھوار بن کر گرتی فوّارے کی طرح پھوٹتی، بارش کی پہلی بوندوں جیسی فرحت بخش، اس کی چٹختی جلد برستی خوشبو کو چوا لیتی۔ وہ دھوئیں جتنی ہلکی ہو کر اُڑی اُڑی پھرتی اور جب واپس آنے لگتی تو فجر کا وقت کب کا نکل چکا ہوتا، پَو پھٹ چکی ہوتی، صبح کے آثار نمایاں ہو رہے ہوتے اور بُوجی چلّا رہی ہوتیں "لے لاڈو آج پھر سونے سے نماز فوت ہو گئی، اب تو اُٹھ جاؤ ۔۔۔۔"

آنکھیں ملتی ہوئی وہ اُٹھتی تو گذرے واقعے کی یاد کی طرح ہوا میں خوشبو کا باسی پن ملا دلا ہوتا اور رات کی رانی باغ میں سر جھکائے

کھڑی ہوتی جیسے اپنے آپ کو بے قصور ظاہر کر رہی ہو کہ رات کی بات میں اس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کیا پتہ، میں تو مہک رہی تھی ------ دھوپ چڑھنے لگتی تو خوشبو کب کی اُڑ چکی ہوتی، کمھلائے ہوئے پھول جھاڑی کی ٹہنیوں میں جھول رہے ہوتے اور مہک ان میں لوٹ چکی ہوتی۔ خوشبو بھٹکتی تو دھیان بھی اُچٹ جاتا۔ بیسیوں کام سامنے آجاتے۔ دن بھر کا ریندھا چل پڑتا اور وہ کام دھندے میں ایسا جُٹتی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ کچے فرش پر رات بھر میں مٹی کی تہہ بچھ گئی ہوتی کہ پیر رکھو تو پورا پنجہ اس صفائی سے اُبھر آئے جیسے کچی نیند میں خواب ------ "صبح کے وقت باسی گھر میں بیٹھنا نحوست ہے"، بُوجی کا کہنا تھا۔ نِندا سے ہاتھوں سے وہ جھاڑو پھیرنے لگتی اور جب ریت کی جمی تہہ ہٹ کر فرش چندن سا نکھر آتا تو آنکھوں سے باقی ماندہ نیند رخصت ہو چکی ہوتی۔ رات کے جھوٹے برتنوں میں بچا ہوا کھانا، سالن کی جھوٹن، چُسی ہوئی ہڈیاں، روٹی کے سوکھے پپڑے جمع کر کے بِلّے کو ڈال دیتی اور برتن نل کے پاس ڈھیر کر لیتی۔ جھوٹے برتن میں بھر مُٹھی راکھ جھونکتی اور سُوکھی تُرئی کے جُوٹنے سے اتنا رگڑتی کہ گورے ہاتھ راکھ میں لتھڑ جاتے اور سَنے ہوئے برتن میں جمی رات کی چکنائی کٹ کر نکل جاتی۔ دھو کر برتن دھوپ میں چُن دیتی تو شیشے کی طرح جھلا جھل کر رہے ہوتے اور شفاف ایسے کہ ان میں

عکس جھلملا جاتے، جانو وہ برتن میں ہی تو ہے۔ منجھے ہوئے تھال میں آٹا نکال لیتی اور گوندھتی جاتی، اس کے ہاتھوں کی تھپا تھپ سے لگن بج اٹھتی اور آٹے میں لوچ آنے لگتا۔ اس کے گول گول پیڑے بنا کر بیل لیتی اور پتلے پتلے ورقے توے پر ڈالتی جاتی، خوب سنکی ہوئی روٹیاں لپا جھپ اُتارتی جاتی اور ڈھیر جماتی جاتی، پھر بھتی کی بھتی لا کے دسترخوان پر دھر دیتی۔ دن بھر وار نہیں آنے پاتا، ذرا ہاتھ تھما اور دھیان میں جگنو چمکنے لگے ------ کبھی نہانا ہوا تو بال کھول ڈالے اور ریٹھوں سے دھو لئے۔ نالی میں ملگجا پانی بہتا جاتا اور گیلی لٹوں کی کلونس پہ ایک چمک آ جاتی۔ نہا دھو کے بالوں میں کنگھی پھیرتی، گیلے بالوں کی لٹوں میں کنگھی کے دانے راستہ کترتے ہوئے نیچے پھسلتے تو ان پہ پانی کی موتی جیسی بوندیں ڈھلکتی ہوئیں اور چوٹی گوندھنے کے لئے گیلے بالوں کی لچھیاں سی بٹ لیتی جیسے ریشم کی ڈور ------ اگر بال ٹوٹ کے کنگھی میں آئے ہوتے تو ان پر تھتکار کے احتیاط سے ان کا چھلا بنا کے چولہے میں جھونک دیتی کہ بالوں میں تاثیر ہوتی ہے، کسی غیر کے ہاتھ نہ آ جائیں، اور بال پھینک کے آنگن میں آ جاتی۔ آنگن میں شام کو چھڑکاؤ کے بعد گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو ہوا میں اُڑتی۔ بیلے اور چنبیلی کی کیاریوں کے پاس گھڑونچیوں پہ پھولوں کے گجرے اور جھل جھل کرتے کٹوروں سے ڈھکی کوری صراحیاں اور گھڑے دھیمے دھیمے

مہکا کرتے۔ بُوجی پیڑھی پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہوتیں، سَرو تا روک کر اُسے ٹوک دیتیں کہ یہاں نہ بیٹھو، لڑکی نہائی دھوئی ہو شام کا وقت ہو تو پیڑ پودوں کے پاس نہیں جاتے، سایہ ہو جاتا ہے۔ پرانی حویلی کے سہمے ہوئے سکوت میں خوف کا واہمہ رینگنے لگتا۔ کہیں خوشبو میں بھی آسیب نہ ہو؟۔۔۔۔۔

② گھمن گھیری دوپہر

برسات میں حویلی کی دیواروں پر لونی لگتی اور چھت سے مٹی جھڑ کے فرش پر ننھی ننھی ڈھیریاں بنا دیتی، یہی دیواریں جن میں سیلیں اور ٹھنڈک بس کر رہ جاتی کہ چھوؤ تو ٹھنڈی ٹھار؛ گرمیوں میں ان سے لُو ٹکرا کے پلٹتی اور کمرے تپ چڑھے مریض کے سانس کی طرح پھنکنے لگتے۔ دوپہر کو کھانے وانے سے فرصت پا کر ڈیوڑھی کے کواڑ بھیڑ اور دالان کے پردے چھوڑ، پٹ اندھیرا کر کے سب لیٹ رہتے۔ خس کی ٹٹیاں بندھ جاتیں اور ان پر وقفے وقفے سے پانی کے تڑیڑے ڈال کر چھڑکاؤ ہوتا جاتا، کوری برنجی صراحیاں اندر رکھوالی جاتیں اور ملازم چھوکری دھیرے دھیرے پنکھا کھینچتی، فرشی پنکھے کی لمبی ڈور کھینچتے کھینچتے خود بھی نیند کے جھونٹے کھانے لگتی۔۔۔۔۔۔ سہ پہر جب دھوپ ممٹیوں، کوٹھوں، چھتوں سے نیچے اتر کے دیواروں سے لپٹنے لگتی تو بُوجی پردے کھول دیتیں، یک لخت دھوپ آن کر آنکھوں میں چکا چوند مچا دیتی اور سب

Scanned with CamScanner

باہر آجاتے، باہر فالسے کا شربت یا تربوز کی قاشیں ملتیں۔ اس سے پہلے ان کی مرضی نہیں تھی کہ کوئی باہر نکل سکے، "ان گھمن گھیری دوپہروں میں چڑیلیں پھرتی ہیں اور بچھل پائیاں آتی ہیں"۔ جس کو نیند نہ آتی وہ بھی زبردستی آنکھیں میچے پڑا رہتا۔۔۔۔۔۔ بوسیدہ دیوار میں ٹھنڈا نم چڑھنے لگتا کہ خشک ہوا میں اس کی تبخیر بھر جاتی تو ہوا بھیگی چنری کی طرح بھاری ہو کر نیچے ڈھلکنے لگتی، جانو کمرہ نہیں ہے کوئی تہ خانہ ہے جو صدیوں سے نہیں کھلا جس میں زمین کے اندر کی بے جان سردی رچ بس گئی ہے اور محبوس ہوا میں غشی کی تاثیر۔۔۔۔۔۔ آنکھیں جھپکنے تک باتیں چیتیں ہوتی رہتیں، پرانوں کی یادیں، بھوت پریت جو طلسمی دوپہروں، آسیبی شاموں میں منڈلاتے رہتے، ٹوٹکے جو نامعلوم خوف کا دف مار دیتے، اور گذری باتیں، "اے بی، کھڑکی کی اوٹ میں مکھیوں نے چھتہ بنا ڈالا اور کسی کے سان وگمان میں نہیں۔ ایک روز بوا مار ھٹسے میں بن سنور خوب عطر خوشبو لگا کے جو وہاں سے گذریں تو مکھیاں خوشبو پر نکل آئیں اور ان کے چپٹ گئیں۔ پھولوں کا رس تو ان غریب میں کیا ملتا، مکھیوں نے بھنبھوڑ بھنبھوڑ کے ادھ مُوا کر ڈالا۔۔۔۔۔۔" رفتہ رفتہ باتوں کی تہہ میں نیند گھلنے لگتی، پپوٹے نیند سے بھاری ہوئے جاتے، آنکھیں مُندنے لگتیں، کالی کوئیا سی آنکھیں گھاس بھری منڈیروں سے نیند کا

Scanned with CamScanner

پھسلواں راستہ بچھانے لگتیں جس پر چلتے چلتے آتے آتے اگر جو کبھی نیند کا پیر رپٹ جاتا تو آنکھ پٹ سے کھل جاتی ------ سب سو رہے ہیں، گھپا گھپ اندھیروں میں اُس کی پتلیاں جگار مچا رہی ہیں، نیند ہے کہ آتی ہے اور آتے آتے چھل کر جاتی ہے ------ سناٹے میں بوجی کے خراٹے گونجتے، جی دہل جاتا کہ جیسے خراٹے نہ ہوں اندھیرا سوتے میں سانس لے رہا ہو ------ باہر صحن میں دھوپ فرش پر چنائی کرتی ہوئی آتی اور دالان کے پردوں میں اُلجھ کر چینی کی تشتری کی طرح ٹوٹ جاتی، اگر جو کوئی رمتی کوئی کرچ پردے کی درزوں میں سے بھولے بھٹکے اندر آنے پاتی تو اندھیرے کو کاٹتی ہوئی اُجالے کی لکیر بناتی جاتی۔ وہ دم سادھے پڑی اس کو تکا کرتی کہ دھوپ روشندان سے چھن چھن کر چھت پر نقش بنا رہی ہے اور پنکھے پر پڑ رہی ہے، پھر چلتے ہوئے پنکھے سے یوں پھیل رہی ہے جیسے فوارے سے حوض میں اُٹھتا ہوا پانی۔ وہ دیر تک دھوپ کو فرش پر جھلملاتے، ماہی جال بُنتے دیکھتی رہتی کہ ہوا کے خفیف جھونکے سے پردہ لرزتا اور دھوپ کا ڈیزائن بدل جاتا، کبھی رنگترے کی پھانک سی کھل جاتی اور کبھی ساٹن کے تھان سمٹ جاتے، کبھی دھوپ کا پھول کھل اُٹھتا اور کبھی دھوپ کی کرچیاں ہو جاتیں ------ لیٹے لیٹے جو ذرا پہلو بدلا بوجی کے خراٹوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور وہ زور سے ہنکارا بھرتیں۔ جو کبھی اُٹھنا چاہو تو فوراً

گھرک دیتیں کہ کہاں چل دیں، لیٹی رہو ------ وہ وہیں دبک جاتی۔ بس اَنّو کا دم تھا کہ بلّی کی طرح دبے پاؤں، پنجوں کے بل چلتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا اور پردے میں سے یوں نکل جاتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور دھوپ بھری گلیوں میں گھومتا پھرتا۔ ایک دفعہ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کھسک لی تھی۔ باہر باغ میں سوکھی مرنڈ گھاس، گلیارے میں چُپ کا راج، کبھی کوئی ٹٹیری پکارتی گذر جاتی ------ جلتی دوپہریا میں زمین گرم بالو جیسی تپتی ہوتی اور مکانوں کے پتّھروں سے آنچ اٹھتی۔ دہکتا سورج جھلاجھل جلتا نارنجی سفید ہو رہتا، کرنیں نیزہ سی سیدھی چُبھتیں، فرش پر پیر رکھے سے جلتے مگر اَنّو اِدھر سے اُدھر گُدگُدے لگاتا پھرتا۔ چھلاوے کی طرح اس گلی سے نکلا اُس گلی میں، اس سے اُس میں، یہاں سے واں، دم بھر میں حاضر دم میں غائب، کوندا تھا کہ لپکا اور چھُپ گیا، اس کو رونیوں رُلوا دیتا کہ اچانک کہیں پیچھے سے نکل کر ہاؤ کرتا اور کہیں اُس کی چُٹیا پکڑ کر کھینچتا کہ "آپا چُہیا کی دُمچی ------" اور منڈیروں پر چک چک کرتی، گچھے دار دُم پیٹھ پر چنورے اُچھلتی پھرتی گلہری پکڑ کر اس کی طرف اچھال دیتا اور تالیاں بجاتا کہ چہیا کی بہن گلہری، اور گلہری اس کی گود سے اُچھل، زن سے اس کے پیروں کے بیچ سے ہوتی ہوئی نکل بھاگتی۔

اندھیرے میں تھکے ہاتھ پاؤں دھوپ میں دوڑتے کودتے چلتے چلاتے کھل جاتے جیسے بھاپ میں نہلا دیئے گئے ہوں، سارے میں سنسناہٹ دوڑنے لگتی جو ایک ذرا کے ذرا میں باریک سوئیوں کی مسلسل چبھن بن جاتی کہ کپڑے کاٹنے لگتے اور بدن جھوجرا جاتا، تمتمایا ہوا منہ لال بھبھو کا ہو جاتا، کنپٹی دہکنے لگتی، ماتھے سے پسینے کے موتی دانے بلبلوں کی طرح پھوٹنے لگتے، قمیص پر گیلی دھاریاں ابھر آتیں اور بال پسینے میں تربتر ہو کر چپکنے لگتے، گرمی حال سے بے حال کر دیتی ---- اور اَنوا اس کو چھیڑتا "بھُتنی"۔ لگتا کہ گرمی نے اسے واقعی بھُتنی بنا ڈالا ہے، طبیعت میں جھونجھ آنے لگتی، منہ بسور کر چپ ہو رہتی اور کچھ نہ بولتی ---- دھوپ کی تیزی سے آنکھوں کے آگے ترمرے ناچنے لگتے۔ دیواروں سے گرمی کی لپٹیں اٹھ رہی ہوتیں اور تیز چمکتا غبار ہر چیز کو ملفوف کر لیتا کہ جس چیز کو چھوؤ حدت کی سینکڑوں تہیں درمیان ہیں۔ سوکھا منہ چٹخنے لگتا اور جتنا پانی پیو تو تس بڑھتی جاتی۔ پانی پیا جاتا نہیں اور تس مرتی نہیں، گھڑے پاس ٹونگتے ٹانگتے آگ سی دھوپ جھنوا جاتی۔ ڈھلتے دن کی دھوپ آخری ٹیکی نیم کے پیڑ پر دیتی اور جاتے جاتے گھڑونچی کو منور کر دیتی۔ چھٹتی دھوپ کے ساتھ دیواریں لمبوترے سائے چھوڑ دیتیں، پھیلتے سائے گھڑونچی تلے رینگنے، کُلبلانے لگتے ---- دھوپ چھاؤں کا کھیل

Scanned with CamScanner

تھا جو نیم تلے دھری گھڑونچی پر رچ جاتا۔ برنجی صراحیاں، کورے مٹکے، بھٹلیاں، صراحیوں کی گردن سے لپٹے گجرے اور پان کی صافی سے ہوتی ہوئی دھوپ میلی دری کی طرح لپٹتی جاتی اور اس کی جگہ سانولی چھاؤں بچھتی جاتی، نیم کے پیلے سفید ننھے منّے پھول جھڑتے رہتے اور برتن سے ڈھلک کر پانی میں گر پڑتے تو سطح پر دیر تک تیرتے رہتے، بہت ہلکے، نازک جیسے دھیمی سرگوشی جو سُنی نہ گئی ہو۔۔۔۔۔

③ پھولوں جیسی لڑکی

شام ہوتی تو جی لہراتا ورنہ دن بھر ٹھنڈک کے لئے کلستے گذرتا۔ ڈھنڈار حویلی میں یونہی واہی تباہی پھرتی پھراتی جو کہیں آنگن میں آتی تو گرمی سے بولائی چڑیاں جو دم بھر سستانے کو آ بیٹھتیں کہ پیاس سے ننھی چونچیں کھلی ہوتیں اور ہکر ہکر ہانپ رہی ہوتیں، اُسے آتا دیکھ کر پھرّا مار اڑ جاتیں اور پھر سے اُڑ کر باغ میں جا بیٹھتیں۔ ایک دم تو جی چاہتا کہ وہ بھی یوں رات کی رانی پر جا بیٹھے جس کی چھاؤں میں ہلکی ہلکی مہک کا سایہ سا ہوتا اور بلونگڑے کو جھولا جھلاتی جائے، پھر کوئی چٹکی لیتا کہ ایک دفعہ جب وہ جھاڑی کے پاس جا بیٹھی تھی اور شاخوں کو اپنے اوپر جھکا لیا تھا۔۔۔۔۔ دھیان میں پھر وہی خوشبو سی پھیلنے لگتی کہ ایک ٹھنڈک تھی جو جسم میں اُترنے لگی تھی، ایک اندھیرا تھا جو آنکھوں میں چھانے

Scanned with CamScanner

لگا تھا، اندر باہر ایک سا رشتہ بن گیا تھا کہ پتہ نہ چلتا خوشبو اس سے پھوٹی پڑتی ہے یا پیڑ سے۔ کڑی دھوپ کے کالے کوس پیچھے رہ گئے تھے، یہ خوشبو کا جہان تھا، مگر بُوجی خفا کس قدر ہوئی تھیں "خبردار جو پھر گھسی جھاڑ جھنکاڑ میں، کیڑے کانٹے نے کاٹ کھایا تو کس کا اچھا بُرا ہو؟ جوان جہان لڑکی، جو کوئی خوشبو پا کے جن پری آجاوے؟" وہ سر جھکائے سنتی رہی اور کسی کو نہ بتایا کہ جھاڑی میں بلّی کا بچہ پڑا ملا تھا، چھُونے پر سمندر جھاگ سا اور آنکھیں ذرا ذرا کھُلی کہ چمکارو تو نرم پنجے منہ پر پھیرے۔ بُوجی نے بڑے اَبّا سے کہہ سن کر رات کی رانی چھنٹوا دی۔ باغ میں لُنڈ مُنڈ جھاڑی دیکھ کے اسے اپنا وقت یاد آتا جب اس کے سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں اور کسی طور نہ جاتی تھیں تو اس کا سر ہلکا کروا دیا گیا تھا۔ انگلی کی پور برابر بال لئے ہلکی پھلکی ہو وہ مزے سے گھوما کرتی۔ "رات کی رانی کی خوشبو پر سانپ آتے ہیں"، بُوجی کا کہنا تھا۔ سانپوں کو دور رکھنے کے لئے تُلسی کا پودا منگوایا گیا تھا۔ تُلسی کے پتّے پر نہیں دیکھے سے بُوجی کا جُھریا چہرہ دھیان پڑتا۔ رات کی رانی سے آگے کو تلسی لگا دی گئی کہ رات کی رانی پر سانپ آتا ہے اور تُلسی کے پاس نہیں پھٹکتا ------

رات کی رانی دور مہکا کرتی کہ کبھی جھاڑی مہکنے لگتی تو دل اس کا دھڑکنے لگتا۔ دن بھر ہوا بند رہتی اور حبس سے کمروں میں دم گھٹا

جاتا، دالان سے باہر نکل آتی تو تپش میں سوئی سوئی جھاڑی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھ لیتی اور جلدی سے نگاہیں جھکا لیتی۔ بے رنگ آسمان پھٹے دودھ سا گدلا جاتا اور دھوپ کا جھماکا آنکھوں کو چوندھیا دیتا تو جی بھر بھر آتا کہ چھما چھم برستی بادل کی کوئی ٹکڑی، بھولی بھٹکی آجائے کہ گرد و غبار چھٹے، گرماؤ ڈھل جائے، بیل بوٹوں پر پانی پڑے تو ان میں شادابی آئے اور خوشبو سی نشہ آور سرشاری پھیلے جو بارش کا سوچ سوچ کر روکھے پھیکے جسم میں فرحت کی لہر بن کر پھیلی جاتی تھی اور گمان کہ ٹھنڈک سا چین پڑے، سر سے پیر تک سارے میں برف ہو جائے ـــــ برف کا نام آتے ہی ہاتھوں میں سنسنی دوڑ جاتی، برف تو وہاں پڑتی ہے جہاں اَتو چلا گیا۔ جانے اب کیسے جلتی دوپہریا میں باؤلا بنا پھرتا ہوگا کہ ایک گلی دھوپ سے روشن ہوئی اور دوسری میں سائے پھیلے تو دھوپ سے سائے، سائے سے دھوپ میں بھاگتا پھرتا۔ کہتے ہیں وہاں گرمی نہیں پڑتی، سردی رہتی ہے اور برف ـــــ اُجلی جیسی میم۔ میمیں تو اس نے نہ دیکھی تھیں، ولایتی پھول دیکھے تھے۔ ماموں جان کے بنگلے میں لگے تھے، نکھرے نکھرے رنگ بھرے بوٹے، جانو پتیوں پر تتلی پنکھ جوڑے بیٹھی ہے، اور وہاں سے وہ ان کے بیج لے کر آئی تھی۔ بہت شوق سے کیاری بنائی، بیج بوئے، پانی ڈالا، پنیری اُگائی اور جب پھول کھلے تو ان میں

خوشبو غائب! حیرت سے پھولوں کو دیکھا کہ بغیر خوشبو کا پھول کیسا، خوشبو بھی کوئی زیور ہے کہ الگ اُتار کے رکھ دیا، ٹٹولنے میں پھول کا مکھڑا کمہلا گیا، پتلی پتلی پنکھڑیاں پتّی پتّی ہو گئیں اور پیلا زیرہ سفوف کی طرح ہاتھوں پر لگ گیا مگر خوشبو کا پتہ نہیں۔ تب بُوجی نے بتایا کہ انگریزی پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ باقی پھولوں کے بیج بُوجی کے کہنے سے مُمانی کو واپس لوٹا آئی۔ جدھر انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں وہیں ماموں جان کا بنگلہ تھا، ہوا دار کھڑکیوں والا جن میں سے زنّاٹے دار ہوا آنچل اڑاتی، پلّے دوپٹے مَسکتی چلتی، باغ میں ولایتی پھول کھِلتے اور راہی پھولوں سی نازک ان کی لڑکی جو تیتری بنی اُڑی پھرتی کہ اس نے چوٹی کٹوا لی تھی اور کالج میں پڑھتی تھی۔ بُوجی کو ان کے طور طریق سے غیریت کا فرق محسوس ہوتا کہ ان کے گھر آنگن میں بیٹیاں ان کے بتائے ہوئے قرینے سے چلن چلتیں، ہاتھوں میں راکھ مل کر برتن ایسے چمکاتیں کہ شیشہ اور کیاریوں میں چمپا چنبیلی موتیا مہکا کرتے اور رات کی رانی....

④ غیاب کا منظر

رات کی رانی غیاب کا منظر تھی۔ کبھی خوشبو بھی پلّے نہ پڑتی تو سوچتی کہ بُوجی سے پوچھ لے، آخر مہندی کے بارے میں بھی انہوں نے بتایا تھا...... زمین پر بھیجے جانے کے بعد بی بی حوّا جنّت کو یاد

کر کے رویا کرتی تھیں تو ان کے آنسو جہاں گرے وہاں مہندی
کے پودے پھوٹ آئے۔" وہ تعجّب سے سُنتی اور ٹوک دیتی۔
"اے بی کیا کہہ رہی ہو، آنسوؤں سے بھلا پودا اُگ سکتا ہے"
ایک لمحے کو شک پڑ جاتا، پھر خیال آتا کہ کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور ورنہ
چھوٹے چھوٹے مٹھس ہرے پتّے کیونکر پسنے کے بعد پورے پورے رنگ ڈالتے
ہیں کہ انگلیوں میں مشعلیں جلتی ہیں اور خوشبو لو دیتی ہے۔
چیزوں کا اِس سے اُس میں مُبدّل ہونا، نظر کچھ آنا، کچھ کا کچھ
نکلنا، آن کی آن میں کوندے کی طرح لپک جانا، دھندلکے میں
لپٹے ہونا اور پوری آواز سے پکارنا اس کو مستقل جہانِ حیرت میں
رکھے رہتا۔ وہ کئی کئی بار چونک پڑتی۔ حیرت سے گُم سُم ہو جاتی اور
دانتوں تلے انگلیاں داب لیتی کہ کیا تھا، کیسے ہو گیا۔ وسوسے میں
پڑ جاتی کہ کوئی چیز آتے آتے پلٹ پڑتی، تہہ جمتے جمتے چٹخ جاتی، ریت
پر اَدھورے پنجوں کے نقش و نشان اُبھرے ملتے کہ ابھی یہاں
سے کوئی ہو کے گیا ہے، در و دیوار کی پرچھائیاں ڈولنے لگتیں،
کالی بلّی کی طرح راستہ کاٹ جاتیں اور وہ ان کی سمت بڑھتی
تو کنّی کاٹ جاتیں کہ پتہ چلتا یہ آڑے ترچھے عکس کس کے ہیں،
کِس طرف سے آ رہے ہیں کس طرف پڑ رہے ہیں۔ کبھی لگتا کہ اب
اوجھل نہ رہے گا، اتنے پاس سے ہو کے گذرے گا کہ وہ مُڑ کے
دیکھے گی اور چور پکڑے گی، سچ مچ نگاہوں میں نقشہ جمنے لگتا مگر

Scanned with CamScanner

تصدیق کے لئے ہاتھ بڑھاتی تو مٹی ، اور چھوڑ دیتی تو دھیان میں جیسے سوکھے کھوہ پر جل کھمبیاں سانپ چھتریاں اُگنے لگتیں ---- وہ پریشان ہو جاتی کہ خوشبو سے اس کا رشتہ کیا ہے ، اس کی سوتن ہے یا سہیلی ؟ یہ رشتہ بھی پہیلی بن گیا تھا۔ اور پہیلیاں تو بُوجی کو معلوم تھیں۔ کہیں سے کوئی مشکل سے مشکل پہیلی کان میں پڑ جاتی اور لگتا کہ الجھن بنی رہے گی ، پھر بُوجی سے پوچھتی تو انہیں پہلے سے جواب معلوم ہوتا۔ " ہری بھری من بھری تھی نو لاکھ موتی جڑی تھی ، راجہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی ------ " وہ پوچھتی ، بُوجی جھٹ بول اٹھتیں " بھٹا " پھر اس سے پوچھتیں " اِتی سی ڈبیہ ڈِب ڈِب کرے چلتا مسافر گر گر پڑے ----- " تو وہ سوچ میں پڑ جاتی ، ذہن پر زور ڈالنے لگتی۔ نظروں میں سینکڑوں چھوٹی بڑی گول چوکور چوکھنٹی ڈبیاں کھلنے لگتیں ، تہہ میں مخمل بچھا ہوا ، اندر نگینے ، جڑاؤ زیور احتیاط سے روئی پر رکھے ہوئے ، ذرا سا چھونے پر جن کے کھٹکے کھٹاک سے بند ہو جائیں اور مسافر مشکی گھوڑوں پہ سوار ، مخالف ہوا کے زور کو کاٹتے گھوڑے اُڑائے چلے جاتے ہیں کہ ریتیلی راہوں پر نعل لگے سُم پھسلتے ہیں ، مسافر پیٹھنی کھا کے گر پڑتا ہے ، کپڑے جھاڑ کے پھر اٹھ بیٹھتا ہے اور پھر گرتا ہے ، مگر ڈِب ڈِب کرتی ڈبیہ اور مسافر کی کے گرنے میں کیا سمبندھ ؟ کوئی ایک ایسا لفظ

کوئی چیز جو ان دونوں کو ایک رشتے کے تار میں پرو دے، ان کے پوشیدہ معنوی رشتوں کو اجاگر کر دے کہ پہیلی بوجھ لی جائے بہت سوچتی مگر سمجھ میں نہ آتا، سوچتے اندھیروں میں ٹٹولتی کر وہ اسم ہاتھ آجائے جو جادو کی طرح اس کھوئی کھوئی گم سم شے کو تسخیر کر لے، نام لیتے ہی وہ آنکھوں کے آگے کھنچ آئے، اسم کی تاثیر سے خیالوں کا اونگھتا قافلہ جاگ پڑے، جانور بیٹھے بیٹھے سے اُٹھ کھڑے ہوں اور صحرا میں چلتے جائیں تو گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز دور تک کانوں میں چمکتی چاندی اُتارتی چلی جائے، پہیلی نامعلوم سے کھوئے رشتے بڑھ کے جوڑ دے------- سوچتے سوچتے ماتھے پر شکنیں اُبھر آتیں پر سمجھ میں نہ آتا، قافلہ اندھیرے میں اونگھتا رہتا کہ اسے بھٹکنے کا بہانہ مل جائے۔ خالی جھولا اسے پینگ دینے کے لئے بلاتا اور لگتا کہ ہر چیز اس کی مدد کرنے کو تیار ہے، ہوا، پیڑ، در و دیوار، دھوپ چھاؤں..... ساری چیزیں سمجھتی ہیں، اس کی مدد کرنا چاہ رہی ہیں اور دوستی، مگر نہیں کر پاتیں کہ وہ ان کے اشارے، سرگوشیاں نہیں سمجھ رہی، تاسف سے نفی میں سر ہلاتی "میں نے ہار مانی، آپ ہی بتائیے بوجی-----" دور دور تک کوئی فرسنگ، کوئی پتہ نشان نہیں جو گھومتے بھٹکتے ذہن کو دیکھی بھالی چیزوں میں واپس اُتارے ورنہ پہیلی کی ڈور سے کٹا ذہن آسمان میں گم ہوتی پتنگ

بنا پری کتھاؤں، بھوت پریت کے قصوں، آسیب کی داستانوں میں اُڑا چلا جاتا اور کبھی کسی سلسلے پر اَن جانے میں اچانک ہاتھ پڑ جاتا، چیزوں کے رشتے جو بظاہر نظر نہ آتے ایکا ایکی گرفت میں آجاتے، اندھیرے ذہن میں چراغ بھڑک اٹھتا، پہیلی معجزے کی طرح ظہور کرتی ------ اپنی ابتدا و اصل میں پُر اسرار، تشریح سے گریزاں، اچنبھے کی چمک میں لپٹی بات جو اتنی سیدھی تھی کہ نگاہ اُچٹ جائے اور یاد آئے تو پہیلی بن کر۔ اور جب پہیلی کا جواب معلوم ہو جاتا تو بھولتا نہ تھا، ستارہ بن کر ٹنک جاتا کہ اپنی مدھم روشنی میں ہر شے کو نہلاتا رہتا، یادوں سے نیچے گہرائی میں جاکر فطرت میں شامل ہو جاتا، فطرتِ ثانیہ میں جُڑ جاتا کہ بُجھارتوں کا یہ ہشاش بشاش زندہ دل سلسلہ ذہنوں میں اترتا، حیات افروز شگفتگی دیتے دیتے ذہنوں میں جڑیں چھوڑ دیتا اور حقیقی افراد و حادثات کے ساتھ ساتھ پھولتا پھلتا جاتا بلکہ ان سے ماورا بھی، چراغ سے چراغ جلاتا ہوا کہ چراغ کی لو بھڑک کر پھیل جاتی اور دھوئیں کی لکیر پیچاک بناتی ہوا میں تحلیل ہو جاتی ------ پہیلیاں کیا تھیں اسماء و آثار کا ایک کارواں تھا کہ بُوجی کے آگے سے گذرتا تھا۔ جبھی تو وہ چیزوں کی ماہیت جانتی تھیں ------ کوئی پوچھتا کہ گھر میں چھپکلیاں بہت ہو گئی ہیں تو کتنی آسانی سے کہہ دیتیں "اے بی گھر میں چھپکلیوں نگوڑ ماریوں

کا زیادہ ہونا اچھا نہیں، وہم آتا ہے ان نظر چوٹیوں سے کہ کھاتے دیکھ لیں تو کھانے پر نظر لگا دیتی ہیں۔ یوں کرو لمبے بانس پر چنبیلی کے تازہ پھول باندھ کے دیواروں، دو چھتیوں، مچانوں، کواڑوں کے پیچھے پھراؤ جہاں تہاں ان کے ٹھکانے ہیں، اور بانس پھیرتے ہوئے باہر کی طرف لے جاؤ۔ چھپکلی چنبیلی کی خوشبو کے پیچھے چلی آتی ہے --------" بُوجی کی اس بات سے اس کے رینگتے رنگاتے شکوک یونہی سَٹک جاتے اور ذہن بغیر چھپکلیوں کا گھر ہو جاتا۔ بُوجی کو دیکھنی تو حیرت میں بھنور جیسے چکر پڑنے لگتے کہ بُوجی کو شک ستاتا نہ یوں بیٹھے بٹھائے چونک پڑتیں، سیدھے سبھاؤ ناک پر انگلی رکھ کے کہہ دیتیں "ائے نوج ------" ان کا تخیل بدلگام ہو کر نہ بھٹکتا کہ ان کے لئے غیاب اور حضوری کا مسئلہ نہ تھا۔ جو ہے سو ہے، جو سامنے نہیں ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ قدم قدم پر انہیں آثار ملتے، نشانیاں نظر آتیں ------ منڈیر پہ کوّا بولتا تو جان لیتیں کہ آج کوئی مہمان آئے گا، ہچکی آتی تو سوچ میں پڑ جاتیں کہ کون یاد کر رہا ہوگا اس وقت، جانو کوّا مہمانوں کا سندیسہ ہی تو لایا ہے اور ہچکی یہ بتانے کو آئی ہے کہ کس نے یاد کیا ہے۔ بائیں ہاتھ میں کھجلی ہو تو پیسہ ملے گا۔ دایاں کھجلائے تو پیسہ ہاتھ سے جائے گا، آنکھ پھڑکے تو مصیبت آنے والی ہے، کتا روئے تو نحوست ہے، بلّی

Scanned with CamScanner

راستہ کاٹ جائے تو راہ کھوٹی ہو گی، آندھی چلے تو جنات کا شہزادہ جلوس لئے جاتا ہے اور بجلی چمکے تو پہلوٹی کے بچّوں کو بچانا چاہیئے ---------- اور خواب تو شگون تھے کہ ان کی تعبیر نکالی جاتی، اس سے فال لی جاتی۔ وہ حیران ہو کر پوچھتی تو بُوجی تنک کر جواب دیتیں "اب تمہاری طرح کٹ حجتی کی عادت تو تھی نہیں، ہم نے تو یہی سُنا ہے ------" اور پھر اسے اس اہتمام سے بتاتیں کہ فطرت کے مظاہر منکشف کر رہی ہوں: کھانا کھاتے میں انگڑائی نہ لو ورنہ سب کُتّے کے پیٹ میں چلا جائے گا، سانپ کا نام نہ لو ورنہ وہ سُن لے گا اور آجائے گا۔ جانوروں سے رشتے تھے، سانپ ماموں تھا اور چیل اوپر والی۔ اور رات کو پھول پتّے نہ توڑو، پودوں کے پاس مت جاؤ، پودے سوتے ہیں ------ سمجھو گھر میں بیٹھی ہوئی عورتیں نہ ہوں اندھیری رات کے مسافر ہوں کہ ستاروں کی چال سے راستہ ڈھونڈ رہے ہیں اور اندھیرے میں اٹکل سے نہیں چل رہے تو پھر بارش کے بعد گھاس میں بیر بہوٹیاں چُننے نکلی ہوں۔ بُوجی بتاتیں "اے بی ہمارے یہاں جو املی تھی اس میں کتارے نہیں لگتے تھے۔ پڑوس کے گھر میں نیم تھا۔ اس سے ہم نے اپنی املی کا بیاہ کر دیا۔ املی کو لال دوپٹہ اُڑھایا گیا، نیم کے سہرا بندھا اور محلّے والوں کے پلاؤ زردہ پکا۔ اگلے برس املی میں خوب کتارے آئے ------" وہ

ہکا بکا رہ جاتی۔ اب درختوں کی بھی اپنی حیاتی زندگی تھی۔ لگتا کہ اس کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں، اسے گھور رہے ہیں، اس کی آنکھ بچا کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے ہیں، اشارے کر رہے ہیں۔ اسے ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا۔ گہرائی کا اَنت تھامے خاموش پُراسراریت سے اپنی ہر دم پھیلتی، بڑھتی جڑیں زمین میں اُتارتے ہوئے، کسی خفیہ قوت کی رسیلی زندگی اپنے سینوں میں بھرے ہوئے، معزول دیوتاؤں کی جلالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہوں، اپنے اَن بُجھے اکیلے پن میں اسے قہر و عذاب کا ڈراوا دے رہے ہوں یا اپنی پرستش کے اجرا کے لئے پھُسلا رہے ہوں۔ تمام جوابوں سے بے گانہ، گہری جڑوں کے ذریعے زمین پر اپنا عزم ظاہر کرتے ہوئے اور اوپر ہوا کی بدمزاجی کے آگے چھال سے ڈھکے اپنے کھُردرے مضبوط گھنے جسم رگڑتے ہوئے درخت ۔۔۔۔۔۔۔۔ شام کا سکوت غیر واضح راز کی طرح اس سے گریز کرنے لگتا، ہوا کے جھونکوں میں ہریالی کی سی خُنکی آجاتی، لگتا درخت حرکت کر رہے ہیں، گھوم پھر سکتے ہیں اس کو چھونے کے لئے بے تاب ہیں، جُھک رہے ہیں، اس پر چھائے جا رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے کیاری میں کھڑا دن کا راجہ جھومنے لگتا، پھوار سے باریک سفید پھولوں کے گچھے مونچھیں بن جاتے، تنے کی سخت چھال کا سینہ شاخیں بازوؤں کی طرح جُھکنے لگتیں

اور اس سے مسکرا کر کہتا "آؤ بیٹھو پاس ذرا ......"

۵ بلّی کا بچّہ

مُنہ اندھیرے بُوجی موتیا کی کلیاں چُن لیتیں۔ موتیا میں ایسی موٹی موٹی کلیاں آتی تھیں اور صبح تک چٹک کے اُجلے اُجلے پھول بن جاتیں کہ جھاڑیوں کے ہرے پتّوں میں آبدار موتی اور سیپ کے کٹاؤ جھلکنے لگتے۔ بُوجی دامن پھولوں سے بھر لاتیں۔ کبھی پھول اپنے سرہانے رکھ لئے اور کبھی گجرا بنا کے ہاتھوں میں لپیٹ لیا۔ دھاگے میں پُرَدئے ہوئے پھولوں کے گجرے پر اس کی نظر ٹھہرنے لگتی، لیکن اسے پتہ تھا بن بیاہی لڑکیاں پھول نہیں پہنتیں۔ اور اسے اچّھا بھی نہیں لگتا تھا کہ روز جتنے بھی پھول کھلیں توڑ لئے جائیں اور پیڑ ننگے بُچّے رہ جائیں۔ "ان پھولوں کو اگر توڑ نہ لیا جائے تو پیڑ میں لگے لگے رات بھر میں مُرجھا جاتے ہیں،" بُوجی کہتی تھیں، اور بات تھی بھی صحیح کہ جو پھول آج شام تک تازہ نکھرا ہوا سا تھا اس میں اگلی صبح ملگجا ہٹ آجاتی اور مسلا ہُوا لگنے لگتا۔ موتیا کے ساتھ چنبیلی تھی جو دیوار پہ پھیل گئی تھی۔ چنبیلی کے پھول توڑ کر بُوجی پرانے کپڑوں کے بکس میں کپڑوں کی تہہ میں رکھ دیتیں کہ اس سے کیڑا نہیں لگے گا۔ پھولوں کا رس کپڑوں میں جذب ہو جاتا اور گرمی کے دنوں میں بُوجی کے پاس سے پسینے کی بھکراند میں باسی پھولوں کی اُتری ہوئی مہک شامل ہوتی۔ اسے اچّھا

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

نہیں لگتا تھا کہ پھول توڑے اور سِلوَٹ بھرے کپڑوں میں بچھا دے، وہ تو یہ چاہتی تھی کہ نعمت خانے سے دودھ ملائی چُرا کے بلونگڑے کو کھِلا دے۔ اور بُوجی کو اس بلونگڑے سے بھی دشمنی تھی۔ ان کو اسی وقت سے اس سے للّہی ہو گئی تھی جب انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ بلّی نہیں ہے بلّا ہے۔ کئی دفعہ انہوں نے کہا کہ اسے بورے میں بند کروا کے جنگل میں چھُڑوا دیا جائے، مگر وہ روئی دھوئی تو معاملہ ٹل گیا۔ چوری چوری وہ اسے ترنوالے کھلاتی رہتی تھی اور وہ ہِل کیسا گیا تھا۔ دودھ مَلائی اور چھیچھڑے کھا کر بلونگڑے سے موٹا بِلاؤ بن گیا تھا۔ رُواں نُچے قالین جیسی کھال پر چکنائی چڑھ گئی تھی اور ریشمی پشم جیسی ملائمیت آ گئی تھی، خنگرا سا جسم بھر گیا تھا، آنکھیں اندھیرے میں گوہرِ شب چراغ سی چمکتیں، چُمکارے پر خُرخُرانے لگتا اور نرم گدیلے پنجوں میں ایسے تیز چبھتے ہوئے ناخن چھُپے تھے کہ ذرا کھیل میں خراش لگ جاتی تو اس میں سے خون چھلک پڑتا۔ اُسے بلّے سے کھیلتے دیکھتیں تو بُوجی پھریری لیتیں اور افسردہ لہجے میں سرزنش کرتیں "جنّیں یہ کیا بلا بدتر پیچھے لگا لائیں، کتنی دفعہ لوٹو کا منع کیا کہ لڑکی یہ ٹھیک نہیں۔ عورت ذات پر قبر کے تین دن بھی بھاری ہوتے ہیں۔ کون جانے یہ جانور ہے کہ جانور کے بھیس میں بَلا۔ ایک دفعہ اللہ بخشے ہماری خالہ اماں نے اپنے بچپنے کی سُنی ہوئی بات ہمیں بتائی تھی

کہ سارا کنبہ چاندنی رات میں ہمایوں کے مقبرے کی سیر کو گیا۔ وہاں کسی لڑکی کو جھاڑی میں سے آواز سنائی دی۔ اس نے جو جھانکا تو وہاں بلی کا بچہ پڑا ہوا تھا، روئی سا ملائم اور ذرا سا کہ ابھی آنکھیں نہ کھلی تھیں اور کم زور آواز میں چلّاتا تھا۔ وہ شوق میں اُٹھا لائی، سب نے منع کیا، وہم دلایا مگر وہ اسے پالنے کے لئے گھر لے آئی۔ خوب اہتمام کئے اس کے واسطے۔ چھوٹی سی پلنگڑی بنوائی گئی، گلے میں ریشم کا پٹّا باندھا اور اس پہ ننھے ننھے گھنگھروٹا نکے کہ چلتا تھا تو جھنن جھنن کی صدا آتی تھی۔ اور اس بلّے نے بھی وہ رنگ روپ نکالا، کھا کھا کر دُھس کا دُھس ہو گیا اور لڑکی نگوڑی اسے ایک پل نہ جدا کرے، سارے میں لپٹائے لپٹائے پھرے۔ ایک رات سوتے سوتے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا بلّا اپنی پلنگڑی پہ نہیں ہے، اور چپکے چپکے کہیں باہر کو جاتا ہے۔ یہ بھی اُٹھ کے اس کے پیچھے ہو لی۔ اب بلّا آگے آگے چلا جاتا ہے اور یہ اس کے پیچھے پیچھے۔ چلتے چلاتے سامنے جلسے کا سا سماں نظر آیا، شامیانہ لگا ہے زربفت کی بانات ہے، قالینوں کے فرش ہیں اور مسندیں بچھی ہیں۔ بلّا اندر کو گھس گیا، یہ بھی ایک کونے میں کو ہو گئی۔ بلّے کے آتے ہی اہالیانِ محفل اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک کر تسلیمات بجا لائے کہ شہزادے صاحب آئے۔ بلّا ایک مسند پہ چڑھ بیٹھا اور ناچ دیکھنے لگا۔ کس نے فرمائش کی کہ حضور کی نے نوازی سنے

عرصہ ہوگیا، جب سے آپ نے پردۂ دنیا پر ظہور کیا پرستان کے در و دیوار ترس گئے، اور وں نے اصرار کیا تو بلّے نے کیا کام کرا اپنی دُم منہ میں لے لی اور بانسری کی طرح بجانے لگا، اس میں سے ایسے سُر پھوٹے پڑتے تھے کہ سُننے والے مبہوت ہو گئے، اور بجاتے بجاتے وہ قالین پر لوٹنے لگا اور لوٹتے لوٹتے اٹھا بدن پر لباسِ فاخرہ سر پر سونے کا تاج چمکتا ہوا اور نگاہوں میں ایسی ملاحت کہ سب جُھک گئے۔ لڑکی نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے چُپکی نکل لی اور اپنے بستر پر آن کے لیٹ رہی۔ صبح جو آنکھ کھلی تو دیکھا بلّا اسی طرح پلنگڑی پر لیٹا میاؤں میاؤں کر رہا ہے۔ اس کی جو شامت آئی تو اس نے ہنسی ہنسی میں کہا اچھا تو شہزادے نے نواز صاحب آپ ہمیں کب سرفراز فرمائیں گے۔ بس صاحب اتنا کہنا غضب ہوگیا۔ بلّا پھُول کر گدھے کا گدھا ہوگیا، بال کھڑے ہو گئے آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور شعلے کی طرح لہرا کر غائب۔ ادھر وہ غائب ہوا ادھر لڑکی غش کھا کر گری اور اُٹھی تو بدن بخار میں بھُنا جائے۔ جمعرات کے جمعرات اس پر اثر ہو جاتا تھا اور رات کو اس کی مسہری سہاگن کے بستر کی طرح مہکا کرتی۔ پتہ چلا وہ بلّے کے روپ میں شاہِ جن کا لڑکا تھا۔۔۔۔۔۔"

وہ حیرت سے بُوجی کا منہ تکنے لگتی اور شک بھرے لہجے میں

پوچھتی "اے بی کیا کہہ رہی ہو ۔۔۔۔۔۔۔" مگر دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگتا، بلّے سے ہول آنے لگتا کہ کہانیوں کے بھیدا سی بلّے کے روپ میں سے نکل کر آ رہے ہوں اور چاروں طرف چھائے جا رہے ہوں۔ بلّے کو اٹھا کر گود میں لپٹا لیتی، اس کی پھدّی ناک پر اپنی ناک ٹکا کر کہتی "اچھا تو حضور شہزادے نَے نواز صاحب ۔۔۔۔۔۔۔۔" کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور بلّے کو اچھال دیتی۔ بلّا میاؤں کر کے پھولوں کی کیاری میں گھُس جاتا اور سر نیہوڑا کے پھولوں کو سونگھنے، ان پر پنجے مارنے لگتا۔ "بلّی بے مروّت جانور ہے، کِرنجی آنکھوں والوں میں وفا کا مادّہ نہیں ہوتا" بُوجی چِلّاتیں "نکالو اسے گھر سے" گھر میں موٹے موٹے چوہے دندناتے پھرتے اور بلّا ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا البتہ ایک دن پڑوس میں پلے ہوئے کبوتروں میں گھُس گیا اور ایک کبوتری کو منہ میں دبا کے بھاگا۔ اس کے بعد واپس نہیں آیا۔ کئی راتوں تک باغ میں سے بلّیوں کے رونے کی آوازیں آتی تھیں اور بلّیاں ایسی دردناک آوازوں میں روتی تھیں جیسے بوڑھی عورتیں ۔۔۔۔۔۔

⑥ پھول کے پیچھے سانپ

زندگی میں دھیرج تھا اور وقت کو عجیب طمانیت حاصل تھی کہ گذرتا تھا تو حیرانگی کو درجۂ تکمیل پر پہنچا کے طبیعت کو

Scanned with CamScanner

سیر کرتا جاتا کہ گھاس میں ڈوبا پُرانا پتھر مٹی میں اُترا جاتا، اس پر کائی جمتی جاتی، ٹھیرے پانی سا پُرسکون گھرانہ، کھاتا پیتا رستا بستا جہاں نہ فضیحتے تھے نہ تصادم، نہ تیز و تند موجیں جو سُستی سے بہتے ہوئے ساحل میں ہلچل مچائیں، طوفان بن کے گرجیں۔ نظم کی بندش رکھنے والے خاندان کی زندگی، جس میں توے پر روٹی ڈالنے اور برتن مانجھنے سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس سطحِ آب کے نیچے بھی کوئی چیز ہے جو چہروں پر نقش چھوڑتی ہے اور کرداروں کو آواز سے پکارتی ہے۔ اس سُست موج مُکھ سمندر کی تہہ میں چھوٹی چھوٹی لہریں جو اپنے دھاروں پر بہنے کے لئے ہلکورے لے رہی ہیں، بچے جو افراد بننا چاہ رہے ہیں، اپنا آپ اختیار کر سکنے کی اندرونی پوشیدہ کشمکش اور اتنی شدید کہ اس کے تناؤ سے بال پڑے برتن کی طرح چٹخنے لگیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس چمکیلے دائرے سے پھیلتے بہاؤ کا دریا بن جانے اور اس دریا کی تہہ سے اپنی گیلی مٹی لے کر چک پھیریاں کھاتے گھومتے چاک پر رکھ دینے کی خواہش میں گھلا ملا موہوم سا اندازہ کہ جس سے بھاگ رہے ہیں اسی میں سمائے جا رہے ہیں، ایسی کچ دھات جسے صدیوں پرانے پائدار سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے، جس کا مقسوم جھلا جھل کرتے نفستین مراد آبادی کٹورے جو ایسی مشاقی سے مانجھے گئے ہیں کہ لگتا ہے قلعی ہوئی

ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر ایک رات وہ سوتے سوتے چونک پڑی۔
چڑھتے چاند کی چاندنی مسہری پر اس کے سرہانے سے ہوتی ہوئی
پائینتی تک کھِل اُٹھی تھی اور اس دھیمے اُجالے میں گھُلتے ہوئے
بے رونق اندھیرے میں رُوکھن آگئی تھی۔ آنکھ کھُلی تو اندھیرے
میں کھڑکی تصویر کے چوکھٹے کی طرح جڑی ہوئی تھی، جس میں
سے جھلکتے آسمان کا گدلا اجالا مدھم پڑتے پڑتے ہلکا سایہ بن کر
باغ میں کھڑے پیڑ پودوں کے گرد لپٹ کر انہیں سُرمگیں بنا
گیا تھا، کہیں گہرا کہیں بالکل اندھیرا پٹ کہ پیڑ ہوا کے ساتھ
ہلتے تو اندھیرا لہریں لینے لگتا اور پیڑ چمکتی کالی ہوتی ہوئی
پرچھائیاں جو دبے پاؤں گھُپ رات میں گھاس پر چل رہی
ہوں۔ سکوت سہمانے لگا، کھُلی کھڑکی کے احساس سے پیٹھ پر
چیونٹیاں رینگنے لگیں، ایک بارگی پیچھے مڑ کر دیکھ لینے کی خواہش
اور ڈر کہ کوئی کھڑا نہ ہو پیچھے، اَن جانی چاپ کے پیچھے دل چل
پڑتا۔ بہت ڈرتے ڈرتے ٹیڑھی آنکھوں سے جھانکا۔ کھُلی
کھڑکی کے گدلے اندھیرے میں جہاں رات کی رانی اور دن
کا راجہ جُھکے ہوئے تھے، ایسی ڈراؤنی شکل تھی، بھیانک اور اتنی
حقیقی کہ پھٹی پھٹی آنکھیں نکالے لال لال زبان لپھڑے کھڑی
ہو۔ وہ دہشت زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ بھوت ہے یا بچا؟ یا کہیں
وہ بلونگڑا تو نہیں واپس لوٹ آیا اور اس وقت اس کی نظروں

کے سامنے جن شہزادہ بن رہا ہو۔ وہ مسہری پر بیٹھی کانپتی رہی، رنگ فق، سانس سینے میں نہ سمائے اور آنسو گھٹ کے رہ گئے۔ ایسے میں چپکے سے اس کی سہیلی بن کے رات کی رانی کھڑکی سے مہکتی ہوئی آئی اور اس کے بال سنوارنے لگی۔ تسلی دے کر اپنے زانو پر اس کا سر ٹکا لیا، خوشبو چپکے سے اس کے برابر لیٹ گئی، اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لپٹا لیا اور گلے میں ہاتھ ڈال کر دھیرے دھیرے اس کا سر سہلانے لگی۔ وہ اس کے گرم مہکتے بدن کے گہرے اندھیرے اور غنودگی میں دھنسنے لگی۔ رات بھر اس نے خواب دیکھا کہ وہ رات کی رانی میں تبدیل ہوئی جا رہی ہے، لیٹے لیٹے ٹانگوں کے ڈنٹھل بن جاتے، جسم لچکنے لگتا، بازو شاخیں بن کے نکل آتے، بال پتوں میں بدل جاتے اور سینہ پھولوں کے بھرے بھرے گچھوں سے لد جاتا، وہ مہکنے لگتی۔ رات بھر خواب دیکھتی کہ وہ رات کی رانی بن کر مہک رہی ہے اور سینکڑوں سانپ جھومتے جھامتے اس کی سگندھ پر پھن کاڑھے چلے آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ مہک رہی ہے اور سانپ آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ صبح اٹھی تو ذہن تازہ تھا، رات پلکوں میں بیلے کی کچی کلیاں بندھی رہ گئی تھیں۔

(۱۹۷۸ء ــــ ۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

یادوں کے پردیس

"جو کچھ کھویا تھا میں اس کو ڈھونڈنے نکلا
غنیم شہروں میں ------"
"اشیاء کی جستجو کا مارا"
پابلو نرودا (۱۹۶۹ء)

جوں جوں اسٹیشن قریب آرہا تھا ابا جان کی حالت اُس پیاسے کی سی ہو رہی تھی جو کنوئیں کے نزدیک پہنچ رہا ہو، اور جیسے ہی گاڑی اسٹیشن پر رُکی ابا جان دوڑ کر اُترے، نیچے جُھک کر زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور اپنے ماتھے پر تلک کی طرح لگا لی۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ طارق نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو یہ تو ہونا ہی تھا۔ سارے راستے ابا جان کی یہی کیفیت رہی تھی، ڈبے میں ٹہلنا۔ شعر پڑھنا، کبھی کھڑکی کے پاس جا بیٹھیں، کبھی سگریٹ سُلگا لیں، پھر دو تین کش لگا کر دور اُچھال دیں،

Scanned with CamScanner

اور چہرے پر برسات کی گھٹائیں تلی کھڑی تھیں کہ ذرا اشارہ ملے تو ضبط کے بندھن ٹوٹ کر بہہ جائیں۔ سارے راستے طارق اور میں یوں خاموش تھے جیسے موقعے کی سنجیدہ اہمیت نے ہم پر بھی غلبہ پالیا ہو۔ طارق نے دو تین دفعہ منہ سے طبلہ بجا کر تان لگائی "کنٹری روڈ ٹیک می ہوم ....." مگر کسی کو ہنسی نہ آئی۔ اِس کیفیت کا اندازہ ہو جاتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں، اُٹھے ہوئے قدم لیکن واپس تو نہ ہو سکتے تھے، اب تو اسٹیشن آچکا تھا، گاڑی ٹھہر چکی تھی، ابا جان پر خاک گزیدگی طاری تھی، طارق سامان اُتروا رہا تھا اور میں ہندوستان کی سرزمین پر اپنا پہلا قدم اس احتیاط سے رکھ رہا تھا جیسے یہ کوئی شگون ہو۔

پلیٹ فارم پر اُترتے ہی میں دُبدھے میں پڑ گیا۔ کانوں میں ابھی تک ریل کی چھکا پک گونج رہی تھی اور مجھے احساس نہ تھا کہ پیروں تلے ریل کے ڈبے کا ہلتا ڈولتا فرش نہیں، نرم بھربھری مٹی کا استحکام ہے۔ ریل آہستہ سے کھسکنے لگی تو یک لخت یہ خیال آیا کہ جہاں سے ہم آئے ہیں اس جگہ سے تعلق کا دھاگہ کھنچ کر ٹوٹ رہا ہے، یہاں ہم دوسرے خطّے میں آگئے ہیں، جس کی اپنی دنیا ہے، اِس کا اپنا مرکزِ ثقل ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ڈھلتی شام کا سورج انگریزی دور میں بنے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے پیچھے چھُپ رہا تھا۔ کولونیل دَور کی یہ عمارت،

Scanned with CamScanner

اسٹیشن کی گہما گہمی، مسافروں کی بھیڑ بھاڑ، قُلیوں کی چھین جھپٹ، فقیر، سودا بیچنے والے، تماشائی، بچّے، کُتّے ---- ہم ان سے ناواقف تو نہ تھے۔ کیا یہ واقعی کوئی دوسرا ملک تھا؟ ہمارے ملک سے کیا فرق تھا؟ یہاں اسٹیشن کا نام انگریزی کے ساتھ دیوناگری حروف میں لکھا تھا ------- لمبی ٹانگوں والی مکڑیوں جیسے ان حروف میں کیا اسی جگہ کا نام لکھا تھا جو ہم بچپن سے سُنتے آئے تھے؟ اور یہ نل کی ٹونٹیوں پر جو لکھا تھا ہندو پانی اور مسلم پانی تو اس کا کیا مطلب تھا؟ میں نے ابا جان سے پوچھنا چاہا مگر وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں اور کچھ دھندلا دھندلا سا یاد آ رہا ہو۔ ابا جان تو ماضی کے نقوش ابھارنے میں لگے ہوئے تھے، ہم نے اکہ بلا کر اس میں سامان رکھ دیا۔ چارخانے کی پھٹی تہمد پہنے، بیڑی پھونکتے زرد رو اکّے والے کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ہمارے لئے اجنبی ہے اور یہ کراچی میں ہمارے گھر کے سامنے والی سڑک پر تانگہ نہیں دوڑاتا ہوگا۔

"کہاں جائیے گا؟" اس نے پوچھا۔

"فتح گڑھ ---- کوٹھی منجھلے میاں ----" ابا جان نے بہت مسکرا کر جواب دیا، جیسے پتہ نہ بتا رہے ہوں مسرت بھرے طلسمی

خزانے کی چابی اُس کے حوالے کر رہے ہوں، پھر ہمیں بتانے لگے کہ ہمارا آبائی مکان اتنا مشہور تھا کہ لوگ اس کے حوالے سے راستہ بتایا کرتے تھے۔

اکّے والے نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ اکّہ چل پڑا تو اس نے پیچھے مڑ کر ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھا جیسے ہم مسافر نہ ہوں ماضی کے بھوت ہوں، اپنے غار سے نکل آئے ہوں، شہر کے دو کانداروں کو کئی سو سال پرانے سکّے دیتے ہوئے اصحابِ کہف ہوں۔

"پاکستان سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بھائی۔۔۔۔" ابا جان نے کہا۔

"میں نے سوچا ایک بار اپنے بچوں کو یہ جگہ دکھا لاؤں۔۔۔ ہم یہیں کے رہنے والے ہیں۔ یہیں میری آنول نال گڑی ہے، اور اب کوئی تیس برس کے بعد یہاں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ محسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔" انہوں نے ہمارے چہروں کی طرف دیکھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا، مگر اس وقت اُن کے لئے چُپ رہنا ممکن نہ تھا۔ "کیوں میاں اکّے والے کتنے برس سے یہاں ہو؟ ہمارے زمانے میں فتح گڑھ میں کئی اکّے والے تھے، کلّو، پُتّو، حفیظ، مٹھوا، گوری شنکر۔۔۔۔"

"کچھ مر گئے، کچھ پاکستان چلے گئے، دو ایک اب بھی ہیں گے"

اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

"وطن واپسی کا عجیب احساس ہو رہا ہے ۔۔۔۔" ابا جان نے دھیرے سے کہا۔ اس کا اندازہ ہمیں ان کے چہرے کی سُرخی سے ہو رہا تھا۔ ابا کی وجہ سے ہی تو ہم ہندوستان آئے تھے ورنہ ہم دونوں بھائیوں کا خیال تھا کہ اب کی چھٹیوں میں پارے ماموں کے پاس کینیڈا جائیں گے، کچھ سیاحت تو ہوگی، کہہ تو سکیں گے کہ سفر کر کے آئے ہیں، یہ کیا کہ انڈیا ہو آئے، وہی کالے کالے لوگ، ویسی ہی شکلیں، وہی بھیڑ اور شور شرابا، بدنظمی، غربت، گندگی جو ہم اپنے ملک میں دیکھتے آئے ہیں، یہ بھی کوئی فارن کنٹری ہے کہ لگتا ہے لالو کھیت غریب آباد میں گھوم رہے ہیں، ہم سوچ سوچ کر انڈیا کی برائیاں ڈھونڈتے رہے۔ "آپ وہاں کیوں جانا چاہتے ہیں، آپ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ اپنی کشتیاں، میرا مطلب ہے ریلیں جلا کر آئے تھے"، طارق نے کہا، میں نے بھی اعتراض کیا "جس انڈیا کو آپ دیکھنا چاہتے ہیں اس کے لئے ریل سے نہیں ٹائم مشین سے سفر کرنا ہوگا"، مگر اس کا کیا علاج تھا کہ پاکستان آنے کے بعد بھی ابا جان کے دل میں ہندوستان کی یاد اس طرح بسی ہوئی تھی جیسے شادی شدہ آدمی کے ذہن میں کالج کے رومان کا خیال۔ ان کا تو یہ حال تھا کہ آل انڈیا ریڈیو سے فرمائشی

Scanned with CamScanner

فلمی گانوں کے پروگرام میں اگر فتح گڑھ فرّخ آباد کا نام نشر ہو جاتا تو ان کا دل دھڑکنے لگتا کہ جانے کون ہو گا جس نے اس گانے کی فرمائش بھیجی ہے، ہمارے زمانے میں گوپال نام کے دو تھے خبر نہیں اُن میں سے یہ کون ہے، گانا تو اچھا ہے اور آواز بھی لتا کی ہے، پھر کمال دیکھو کہ جو ہم کراچی میں بیٹھے سُن رہے ہیں وہی گانا ہم سے چھوٹے ہوئے شہر میں بج رہا ہو گا۔۔۔ ہندو مسلم فساد کی خبر آتی تو ان کا کھانا پینا چھوٹ جاتا اور جب انڈیا پاکستان کا ٹیسٹ میچ ہوا تھا تو ان کا دل دو نیم ہوا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ ہندوستان آنے کی اُن کی خواہش اتنی شدید تھی کہ امّی جان کی مخالفت سے بھی کچھ فرق نہ پڑا۔ ہندوستان کے سفر کا نام سن کر امّی بھڑک اُٹھتیں۔۔۔۔۔ انہوں نے ہندوستان جانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اتنے دنوں کے لئے چھوٹی خالہ کے یہاں چلی گئی تھیں۔ ہم انہیں خالہ کے گھر چھوڑ کر آئے تو ان کی نظریں چھلک رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ امّی جان پانچ سال کی تھیں جب دہلی میں فساد ہوئے اور ان کا کھاری باؤلی والا گھر تباہ ہوا تھا۔ امّی نے اپنی آنکھوں سے اپنا رستا بستا گھر اُجڑتے دیکھا، ان کی نظروں کے سامنے اسے لوٹا گیا، سارا سامان چھینا اور مکان میں آگ لگا دی گئی، اور ان کے سارے بہن بھائی کئی دن تہہ خانے میں چھپے رہے، نانا میاں

نے شکاری بندوق تیار کر رکھی تھی اور نانی نے اپنے لئے زہر کی پڑیا ------- پھر چھپتے چھپاتے پرانے قلعے پہنچے، وہاں بے آسرا پڑے رہے، بڑی مشکلوں سے لاہور جانے والی ریل میں سوار ہوئے ------ اس ریل پر سکھوں نے حملہ کیا اور آدھی ریل کٹ گئی۔ پُر امن محفوظ زندگی کے کئی سال بھی امی جان کے ذہن سے اس دہشت کو نہ مٹا سکے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی ریل کا سفر نہیں کیا۔ اور جب ہم روانہ ہونے لگے تو طارق کو اور مجھے ریل میں بیٹھا دیکھ کر ان کا منہ سفید پڑ گیا --------- چھوٹی خالہ نے ان کے کان میں کہا باجی۔ کمال ہے تم دولہا بھائی کو اکیلا جانے دے رہی ہو وہاں وہ تمام ہندونیاں ہوں گی جن پر انہوں نے کالج کے زمانے میں نظمیں لکھی ہوں گی۔

"دیکھو، دیکھو ----" ابا جان نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ "بس ذرا اور آگے سے کوٹھی کی چھت نظر آنے لگے گی دیکھنا۔" ابا جان آگے کی طرف جھکے جا رہے تھے کہ پہلی جھلک فوراً دیکھ لیں۔

اکہ چرخ چوں چرخ چوں چلتا چلا جاتا تھا، سڑک کے دونوں طرف سپاٹ پیلی چھتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی، کوٹھی تو نہیں، ہمیں تو پرندے

نظر آ رہے تھے، سرخی مائل آسمان میں شور مچاتے ہوئے پرندے جو بسیرا لینے جا رہے تھے اور اتنے بہت سارے کوّے ....!
میں نے تعجب سے دیکھا۔ لگتا تھا کسی بادشاہ کے جنازے پر جمع ہو رہے ہوں اور موت کا کھانا دیکھ کر اُتر آئے ہوں۔

"کہاں ہے؟ کون سی ہے؟" طارق نے بے صبری سے پوچھا۔

دور تک ایسی کوئی عمارت نظر نہیں آتی تھی جو کوٹھی کے اس ذکر سے مطابقت رکھتی ہو جو ہم سُنتے آئے تھے۔

"نہیں نظر آ رہی ہو گی،، ابا جان نے مایوسی سے کہا۔ اصل میں سب کچھ بدل بھی تو جاتا ہے اور پھر اتنا عرصہ ہو گیا... جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو یہاں سے کوٹھی نظر آیا کرتی تھی اور ہم راستے بھر دیکھتے جاتے تھے کہ دور سے کوٹھی کے چھجّے صحرا چلتے ہوئے اونٹ کی طرح ڈولتے نظر آ رہے ہیں....."
ابا جان کے چہرے پر پھر وہی کھویا کھویا تاثر چھا گیا جو یہاں قدم رکھتے ہی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح اُن سے گلے لگ لیا تھا۔ "جہاں سے اکہ مڑتا تھا وہاں وکیلوں کے مکان تھے.... شبّن لال وکیل کا مکان، ایوب وکیل کا مکان.... ایوب وکیل مکان بیچ کر پاکستان چلے آئے تھے اور اس مکان میں انکم ٹیکس کا دفتر کھُل گیا تھا۔ اور راستے میں دیکھتے چلو شیشم باغ،

ڈگی تال، پتھر والی مسجد، اس کے آگے موڑ آتا تھا جہاں مولسری کا پیڑ لگا ہوا تھا، اس کے بعد حکیم جی والا مکان، پھر کوٹھی آئے گی، اور آگے چلیں تو کوٹھی کے بعد کالی باڑی اور گولہ جہاں اناج گودام تھا۔۔۔۔۔۔ کالی باڑی میں کالی مائی کی پوجا ہوتی تھی، باقاعدہ مندر تھا۔ مجھے اکثر وہ مندر یاد آتا ہے، صبح کے وقت وہاں سے بھجن کی آواز آتی تھی اور اس کا چھوٹا سا کلس اور اس کا گھنٹہ اور خاص طور پہ ایک منظر جو بہت یاد آتا ہے، وہاں کے برہمن کی بیٹی روپ وتی صبح سویرے گھنٹیاں بجاتی تھی۔ کمر تک کھلے بال، بالوں میں چمپا کے پھول اڑسے ہوئے، لہنگا اور بلاؤز پہنے، ننگے پاؤں کھڑی ہو کر گھنٹیاں بجاتی تھی، اور جو بڑا گھنٹہ بجاتی تھی تو لگتا تھا کہ اس میں جھول جائے گی۔۔۔۔۔ اب تک یہ شبیہہ نگاہوں میں پھرتی ہے۔"

"مگر ہم ٹھہریں گے کہاں؟ کوٹھی میں؟" طارق نے پوچھا۔

"ٹھہرنے میں کیا مشکل ہے۔ یہاں سب اپنے ہیں، کہیں ٹھہر جائیں گے۔ کوٹھی میں اب صرف اوصاف بھائی رہ گئے ہوں گے۔ تم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ جب ہم وہاں رہتے تھے تو ہر وقت ان سے ٹھنی رہتی تھی، ہم سے اور منّے

سے برابر اُن کی لاگ ڈانٹ چلتی رہتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد منّے زور سے ڈکار لیتے تھے اور کہتے تھے اوم بکرا ہضم ساتھ میں ملبو کڑی اوصافچی بھسم، تو وہ ہمیں مارنے دوڑتے تھے۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ ساری جائداد ان کی ہوئی اور ہم حصّہ بٹانے کو نہ رہے تو کیسے اخلاص بھرے خط لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر کوٹھی ابھی تک کیوں نظر نہیں آئی؟"

اکّے والا جو توجہ سے ساری باتیں سن رہا تھا، بول اٹھا "اوصاف بھیا کے عزیز دار ہو اور پاکستان سے آئے ہو؟" اس نے اکّہ روک لیا اور ابا جان کو غور سے دیکھنے لگا جیسے اُنہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایکدم سے وہ چلّایا "منجھلے میاں والوں کے اسلم بھیّا۔۔۔۔۔۔ اسلم بھیا ہو نا؟ مجھے پہچانا؟ میں علّمو ہوں علّمو۔۔۔"

ابا جان اکّے سے اُتر پڑے "علّمو۔۔۔۔۔ ارے تم ہو۔ پہچانے نہیں جاتے۔ اکّہ کب سے چلانے لگے؟"

"کیا کریں بھیّا پیٹ کے کارن سب کرنا پڑتا ہے۔ نائی کی دوکان کب کی چھوڑ دی۔ ججمانوں نے شادی بیاہ پہ بلانا چھوڑ دیا اور بال انگریزی وضع کے کٹوانا چاہتے ہیں۔ فاقوں مرنے کے بجائے یہ دھندا کر لیا۔ تم اپنی کہو بھیّا اچھے تو رہے؟"

"شکر ہے اللہ کا۔۔۔۔ تمہیں یاد ہے علّمو جب میں بھائی جان

سے چھپ کر سگریٹ پیا کرتا تھا تو ایک دفعہ کمپنی باغ میں سگریٹ پیتا ہوا ٹہل رہا تھا اور تم وہاں سے گذر رہے تھے اور مجھے دیکھ لیا تھا اور آکر میرے کان کھینچے تھے، میں نے بہت خوشامد کی تھی کہ گھر میں نہ بتانا اور تم نے اس شرط پر معاف کیا تھا کہ آئندہ سگریٹ نہیں پیوں گا۔"

"وہ زمانہ اور تھا بھیّا جب گھر کا نائی بھی بڑا بن کر اچھی بُری بات پر ٹوک سکتا تھا"

طارق اور میں حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ابا جان جن سے ان کے ماتحت کانپتے ہیں، سڑک کے بیچوں بیچ اکّے والے سے گلے مل رہے ہیں۔

"کوٹھی میں اب کون رہتا ہے؟ اوصاف بھائی رہتے ہیں؟" ابا جان نے اس سے پوچھا۔

"اوصاف میاں کب کے فرّخ آباد چلے گئے۔ کوٹھی کا بس نام ہی نام ہے۔ جو یہاں کے پرانے رہنے والے ہیں وہ اب بھی عادتاً اس محلّے کو کوٹھی منجھلے میاں کہہ دیتے ہیں"

"اور کوٹھی؟" ابا جان کے گلے میں الفاظ اٹکنے لگے۔

"کیا پوچھتے ہو، خود ہی دیکھ لو" اس نے اکّہ روک دیا۔

طارق نے اور میں نے بہت اشتیاق سے دیکھا۔ دو تین کمروں کا کوارٹر سامنے تھا جس پر انگریزی کا بورڈ لٹک رہا تھا "مہیلا ودیالہ"

"یہی ہے؟" طارق نے منہ بناتے ہوئے پوچھا اور ابا جان کی طرف دیکھا لیکن اُن کے چہرے پہ اتنی پژمردگی کہاں سے آگئی تھی۔ "یہ کب ہوا؟" انہوں نے اگلے والے سے پوچھا۔

"کوٹھی کو ڈھائے گئے سات برس ہو گئے۔ آگے تک نالہ پاٹ کے اس کی جگہ افسروں کی کالونی بن گئی ہے۔ یہ اسکول اسی کا ہے"

"اور اس کے سامنے جو برگد کا پیڑ تھا؟" ابا جان کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی جیسے کلہاڑی کی زد میں پیڑ کا تنا۔

"وہ بھی کٹ گیا"

"انا للہ وانا الیہ راجعون ....." وہ نڈھال ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گئے اور میں سوچنے لگا کہ اس مکان سے میرا کیا رشتہ تھا۔ میں نے اپنے آبائی مکان کو نہیں دیکھا مگر اس کا کتنا ذکر سنا تھا، اس کے ایک ایک کمرے، ایک ایک برآمدے کے بارے میں ابا جان ہمیں کتنی دفعہ بتا چکے تھے ــــــ اور اب اس کا نشان بھی باقی نہ تھا۔ یہ محض ایک مکان تھا، تاج محل تو نہ تھا جسے فضا کی آلودگی سے خطرہ ہوتا ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا ثقافتی ورثہ خطرے میں پڑتا ہوا نظر آتا ہے چند پیڑ اور ایک پرانا مکان جس کی بنیادیں ایسے زمانوں میں تھیں جو واپس تو نہیں آسکتے اور بھلائے بھی نہیں جاسکتے۔ اور

فوراً خیال آیا کہ اب ہم ٹھہریں گے کہاں۔ اکے والا تو سامان اُتار کے چلا گیا (وہ کرائے کے پیسے ہی نہیں لے رہا تھا بلکہ چلتے وقت طارق کو اور مجھے چار چار آنے دے گیا کہ بچوں کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے) ہم سڑک کے کنارے سامان لئے بیٹھے تھے اور مجھے انجیل کی وہ آیتیں یاد آرہی تھیں جن میں غریب الوطن یہودیوں کے نوحے تھے۔ ہم کہاں جاتے ؟ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ہم یہاں ہزاروں برس رہے ہیں۔ راہ گیر ہماری طرف شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خاص طور سے ایک موٹا تازہ ہندو، دھوتی پہنے، پگڑ باندھے، بڑی دیر سے ہمیں گھور رہا تھا۔ ہندو مسلم فساد کے سارے قصے ہمارے ذہنوں میں گھوم گئے۔ اور اب وہ ہماری طرف آرہا تھا۔

"ابو ۔۔۔۔۔ دیکھیئے ۔۔۔۔۔۔۔" طارق نے خوفزدہ ہو کر اُس کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے آتے ہی ابا جان کو دبوچ لیا اور ان کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے، مگر وہ تو رو رہا تھا !

"بچو یہ تمہارے بھوپیندر چاچا ہیں انہیں آداب کرو" ابا جان نے کہا۔

"سلام ۔۔۔۔" ہم نے انہیں سلام کرنا چاہا پھر خیال آیا کہ سلام تو یہاں چلے گا نہیں، نمسکار ہمیں کرنا نہیں آتا تھا،

اس لئے ہم نے گڈ ایوننگ کہہ دیا اور بہت خوش کہ بات خوش اسلوبی سے نبھ گئی۔ ہم نے ان کا نام سنا ہوا تھا، یہی تو ابّا جان کے لنگوٹیا یار تھے جن کے ساتھ وہ اسکول سے بھاگ کر باغوں میں پھل توڑنے جاتے تھے۔

"تم لوگ یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ گھر حاضر ہے، چلو گھر چلو..." بھوپیندر چاچا ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ پرانی سی ڈیوڑھی جس کا لکڑی کا دروازہ تھا۔۔۔۔۔۔ ہم نہائے دھوئے اور آن کر بیٹھے ہی تھے کہ تھالیوں میں گرم کچوریاں اور ترکاری آ گئی۔ تھکن اور نیند سے ہماری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر ابّا جان دیر تک باتیں کرنے کے موڈ میں تھے اور بھوپیندر چاچا بھی۔ لگتا تھا یہ دونوں اسکول سے بھاگے ہوئے دو بچے ہیں جو اب بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باغوں اور گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ "یاد ہے ایک دفعہ ماسٹر بچّن لال نے کیسی ٹھکائی کی تھی؟۔۔۔۔" "ہمیں تھوڑی مارا تھا، مُنّے پٹے تھے، مُنّے کہاں کراچی میں ہیں؟۔۔۔۔" "اور وہ سب لوگ کہاں کہاں ہیں؟ پریڈ گراؤنڈ میں اب بھی لڑکے ہاکی کھیلتے ہیں؟۔۔۔" "گنگا گھاٹ کے آگے نیا پُل بن گیا ہے اور کانپور ایکسپریس یہاں بھی ٹھہرنے لگی ہے۔۔۔۔۔" دونوں اپنی یادوں کو اس طرح مِل بانٹ رہے تھے جیسے بچپن میں باغوں سے چرائے

ہوئے امرود، اور چہروں پر سڑک کنارے کھیلتے ہوئے بچوں کی سی خوشی۔ مجھے خاصی حیرت ہو رہی تھی کہ بھوپیندر چاچا ہندو ہو کر بھی اتنا گھل مل رہے ہیں، ہم نے تو ہندوؤں کے متعلق کچھ اور سن رکھا تھا۔۔۔۔۔۔ اگلی صبح ناشتے کے وقت میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ وہ ہنس پڑے "واہ میاں بھتیجے چچا کو بے تعصبی کی سند دے رہے ہو! اس شہر کے ہندو مسلمانوں کے مراسم ایسے تھے کہ تمہاری یہ بے تعصبی کی اصطلاح بھی اس کی تعریف نہیں کر سکتی تھی۔ روزمرہ کے میل جول سے لے کر تیج تہوار تک ایک دوسرے کا احترام اپنے عقیدے کی طرح سے تھا۔ ہر سال عید کے موقعے پر جب تمہارے ابا اور چچا اور دادا نماز پڑھ کر عید گاہ سے واپس لوٹتے تھے تو راستے میں جتنے ہندوؤں کے گھر تھے وہ دروازے پر کھڑے ہوتے تھے اور گزرنے والوں کے کپڑوں پر عطر چھڑکتے تھے۔ تمہارے دادا ہمارے یہاں عید کے دن آتے تھے، پتاجی سے گلے ملتے تھے، سوّیاں کھاتے تھے اور مجھے چاندی کا روپیہ عیدی میں دیتے تھے۔ اسی طرح شب برات میں تمہاری دادی حلوے کا تھال ہمارے یہاں بھجواتی تھیں، ہندو حلوائی خاص طور سے آتا تھا اور الگ بیٹھ کر حلوہ بناتا تھا اور ہندو پلّے دار کو بلوا کر اس کے سر پر تھال بھجوایا جاتا تھا۔ کسی کو

خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ یوں ہندوؤں کی طرح چھوت چھات کر رہے ہیں بلکہ ہر ایک کی انفرادیت کا احترام تھا اسی طرح دیوالی پر شہر بھر میں سب سے زیادہ چراغاں جس مکان پر ہوتا تھا وہ منجھلے میاں کی کوٹھی تھی۔ محرّم میں ہمارے دروازے پر چالیس دن تک سبیل بنتی تھی اور اس میں دودھ کا شربت ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ مگر یہ بھاشن لمبا ہو گیا۔ تم تیار ہو لو تو تمہیں یہاں کی سب جگہیں دکھا لائیں۔"

بھوپیندر چاچا ہمیں نئی بستی کی طرف لے گئے۔ صاف ستھرے بنگلے اور کاٹیج، مکانوں کے آگے پھول لگے ہوئے، دھوپ میں الگنی پر سوکھتے ہوئے کپڑے، تارکول کی سڑکیں جن پر بچے سائیکل چلاتے پھر رہے تھے، کہیں سے ہنڈیا بھُننے کی خوشبو آ رہی تھی اور کہیں سے ٹرانزسٹر پر فلمی گانے۔ زندگی اپنے معمول پر سہج سہج چلی جا رہی تھی۔

"دیکھو ہمارے علاقے نے کتنی ترقی کی ہے" بھوپیندر چاچا نے بہت فخر سے بنگلوں کی قطار کی طرف اشارہ کیا۔ "کتنا موڈرن ہو گیا ہے!"

"یہ ترقی ہے!۔۔۔۔۔" طارق بیچ میں بول اٹھا "کبھی آپ کراچی آ کر دیکھیں جہاں ہم رہتے ہیں"

"میں تو بھئی اپنے حساب سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں پاور ہاؤس

بن گیا، نئی کالونیاں آباد ہو رہی ہیں، دو نئے کالج کھل گئے، بہت بڑا ہسپتال ہے، کئی کارخانے بنے ہیں ۔۔۔۔۔۔" وہ بتا رہے تھے اور ابا جان بے توجہی سے سر ہلا رہے تھے۔ ان کی نظریں جانے کہاں بھٹک رہی تھیں۔

"تم نہیں دیکھ رہے اسلم؟" چاچا جی نے ان کی گرفت کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں۔ بہت فخر کی بات ہے اس علاقے نے اتنی ترقی کر لی ہے، مگر ذاتی طور پر مجھے کچھ اور احساس ہو رہا ہے۔ کل رات کو تم سے پرانی باتیں کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ جگہ میری یادوں کا مدفن ہے، یہاں ہمارے ماضی کے خواب ناک سنہرے دن مدفون ہیں، مگر اب اس جگہ کا حال اور مستقبل دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اس کی الگ ایک زندگی ہے جس میں ہم شریک نہیں ہیں، جو ہم سے آزاد اور لاتعلق ہے، جس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور جس کے لئے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم جو یہاں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اب یہاں نہیں ہیں ـــــــ زندگی اب بھی اسی طرح اپنی دُھن میں مگن رواں دواں ہے، ہم سے اور ہماری موجودگی سے بے گانہ۔ اس احساس سے دُکھ ہوتا ہے"

بھوپیندر چاچا یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ "میں مجھے تو خیال بھی نہیں تھا۔ کہ تم وطن میں اجنبی بن جاؤ گے۔ اچھا چلو اب

پرانے محلّوں کی طرف چلتے ہیں جو سب تمہارے دیکھے بھالے ہیں۔"

ابّا جان نے زیر لب کہا" ڈرتا ہوں وطن کی مٹّی پہچاننے سے انکار نہ کر دے۔ اور اگر پہچان بھی لے تو میں ان گلی کوچوں کو کیا منہ دکھاؤں گا، کیسے کہوں گا کہ اے وطن کی گلیوں دیکھو میں کیا سے کیا ہو گیا۔"

اور ہم؟ میں نے سوچا۔ ہمارا بھی اس سے کوئی رشتہ بنتا تھا؟ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس جگہ کو ہمیشہ سے بند آنکھوں سے دیکھتا آیا تھا۔ اور اب آنکھیں کھول کر دیکھا تو بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مجھے سارے وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے ان گلی کوچوں سے پہلے کبھی گذرا ہوں، تفصیل یاد نہیں رہی لیکن اس کی موہوم سی یاد کا دھندلکا ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے جیسے پچھلے کسی جنم کا خواب۔ یہ اَن دیکھی جگہیں ہمارے لئے اتنی اجنبی تو نہ تھیں جتنے ہم ان کے لئے اجنبی تھے۔ ان کا ذکر ہم کب سے سُنتے آ رہے تھے۔ جہاں ہمارے چچا پھُپھیاں اکٹھا ہوئے وہاں یہ ذکر بن بلائے مہمان کی طرح آ کر محفل میں شامل ہو جاتا اور پھر گھنٹوں یہی باتیں ہوئے جاتیں" کیوں اکرم تمہیں یاد ہے ایک دفعہ اشفاق افیمی روتا ہوا آیا تھا کہ ابّا سالا مر گیا۔۔۔۔ انور تمہیں فلاں یاد ہیں۔۔۔۔۔۔ فلاں جگہ، فلاں واقعہ۔۔۔۔۔ یہ یادیں ہمیں ورثے میں ملی تھیں نسلی حافظے کی طرح موروثی بیماریوں

کی طرح ، جو ہمارے خلیوں میں چھپے ہوئے کروموزومز کی طرح ہم میں موجود تھیں اور ہماری شخصیتوں کو متعین کر رہی تھیں ----- یہ ہمارے لئے بے معنی یا قابل فراموش تو نہ ہو سکتی تھیں۔ اپنے ددھیال والوں سے فتح گڑھ کے حالات اتنی دفعہ سنے تھے کہ انہیں کہانی کی طرح دُہرا سکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے وہاں کے چوک میں کھڑا کر دیا جائے تب بھی میں تیر کی طرح سیدھا اپنے اس آبائی مکان پر جا پہنچوں گا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون سا سلسلہ ہے جو ٹوٹا نہ تھا ؟ ہماری نسل نے نہ وہ معاشرہ دیکھا تھا ، نہ اس کی امی جمی دیکھی نہ اس کا شیرازہ بکھرتے دیکھا ----- ہم نے سورج ڈوبتے نہیں دیکھا تھا ، دھوپ سمٹتی دیکھی تھی۔ یہ باتیں اور واقعات ہمارے لئے اتنا فیسی نیشن رکھتے تھے جیسے زمانہ ماقبلِ تاریخ کے دھندلے ، نیم محسوس شدہ اور نافہمیدہ واقعات ----- یہ ہمارے لئے ایک پوری دیومالا بن گئے تھے۔ ہم اَن دیکھی کے نوستلجیا میں مبتلا تھے۔ ہمیں ماضی کا ورثہ معلوم تھا اور اس کی الم ناک گمشدگی کا شدید احساس تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ماضی کی رو ہے جو اُن سے ہم تک موج کی طرح آتی ہے اور اس بہاؤ میں ہم چھپ جاتے ہیں ، وقت کا ایک ڈیزائن ہے ہم جس کی بُنت میں شامل ہیں ----- ہم جانتے تھے کہ والدین کی نسل اپنے ماضی

کا اتنا ذکر کیوں کرتی رہتی تھی جیسے وہ کوئی لیجنڈری زمانہ ہو، وہی ماضی جو ہمیں خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا، اور خاصا بور۔ میں جانتا تھا کہ ابّا جان کی یہ کیفیت کس لئے ہے کہ چہرے پر شگفتگی اور توقع، اور آنکھوں سے ایسی مسرّت پھوٹی پڑ رہی ہے جو ارضی معلوم نہیں ہوتی اور چہرے کے نقوش پر یہ نقشہ کس جگہ کا اُتر آیا ہے۔

"دیکھو-----" انہوں نے میرا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "دیکھو وہ سامنے جو مکان ہے اس میں مقصودن لال وکیل رہا کرتے تھے۔ جانتے ہو ان کا اصلی نام کیا تھا؟ مدھ سودن----- ہم لوگ انہیں مقصودن کہتے تھے۔ اور وہ جو آگے عمارت ہے اس میں فاروق صاحب رہا کرتے تھے، تمہیں ان کی بیگم یاد ہیں؟"

ہاں مجھے یاد تھا۔ ہمارے یہاں آنے سے تین ماہ پہلے فاروق صاحب کی بیگم کا انتقال ہُوا تھا۔ مرنے سے پہلے ان پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور چیخا کرتی تھیں کہ میں پرائے مکان میں نہیں مروں گی، اور بستر سے اٹھ اٹھ کر گھر سے بھاگ نکلا کرتی تھیں اور لوگ پکڑ کر لاتے تھے، وہ پھر چیختیں تھیں کہ مجھے پردیس کی موت نہیں چاہیئے، میں اپنے گھر جاؤں گی فتح گڑھ-------

اور رات بھر جانے کن کن پرانے دُھرانے لوگوں کے نام لے کر پکارا کرتی تھیں جو جانے کب کے مر کھپ گئے ہوں گے ننّو شاہ ڈاکیہ، اللہ رکھو ٹین بھٹو نک، جعفر ڈھپالی، کوّا ڈھو، کھرنجرے

والے جھبّو، تُلّن، بجّن، موّاں، مٹول، ننھی پٹھانی، نسّن جوتے ساز ------ ان کے سینے سے ہر وقت رطوبت بہتی رہتی تھی۔ ڈاکٹروں نے میمری گلینڈ کا کینسر تشخیص کیا تھا، لیکن اصل میں انہیں کیا تھا، میمری گلینڈ کا سرطان یا میموری کا؟ یادیں جو سرطان بن کر سینوں میں اُتر جاتی ہیں ------ یادوں کی بھی معاودت ہوتی ہوگی ورنہ میرے ابا کیوں بیک وقت ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ ان کو چپے چپے پر اپنی کھوئی ہوئی زندگی نظر آرہی تھی، یہاں اُن کا بچپن "اِڈّی اِڈّی آڑے آڑے" کھیل رہا تھا۔ یہاں اُن کا لڑکپن پتنگ اڑا رہا تھا، یہاں ان کی نوجوانی غزل پڑھ رہی تھی، وہاں فلاں دوست رہتے تھے اور اس گلی میں فلاں ساتھی کا گھر تھا، اور ہر گلی کوچے کے ساتھ وابستہ شکلیں جو ہمیشہ کے لئے کھوئی گئیں سوائے خوابوں کے ------ آنکھیں چمک رہی تھیں اور گلا رُندھا جاتا تھا، بس نہیں چلتا تھا کہ ایک ایک چیز کو گھول کے پی لیں، خوشی سے ناچ اُٹھیں یا اُن دیواروں پہ سر ٹکا کر رو پڑیں ------- وہ راہ چلتوں کو گلے لگائے لیتے تھے۔ اور ہمارا خفت کے مارے بُرا حال تھا۔ بھوپیندر چاچا ابا کا ہاتھ تھامے تھے اور جھینگلی سے بار بار آنکھوں کے کونے صاف کر رہے تھے۔ لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور طارق کا منہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہم یہ تو چھپا نہیں سکتے

تھے کہ ہم ان صاحب کے ساتھ ہیں جو ٹورسٹ گائیڈ کی طرح ایک ایک اینٹ کی تاریخ بیان کر رہے ہیں اور اتنی تیزی سے جیسے چابی زیادہ بھر گئی ہو۔ ہم یہ تو باور نہیں کرا سکتے تھے کہ ہم نسلِ گم گشتہ کے جلاوطن ہیں ------ اس سے پہلے کہ صورتِ حال مضحکہ خیز ہو جائے ابا جان کو ایک چائے خانہ نظر آ گیا اور وہ خوشی سے چلائے "ارے ولی کا ہوٹل! دیکھو بھئی لڑکو...." بھوپیندر چاچا ان کو روکتے رہ گئے اور وہ انتہائے شوق میں اندر کھنچتے چلے گئے۔ کراچی کے ایرانی ہوٹلوں سے بھی گیا گذرا تنگ سا کمرہ تھا، ہم دونوں بھائی تو ناک پر رومال ڈھانپے الگ کھڑے رہے ابا جان کاؤنٹر پر بیٹھے موٹے سکھ سے پوچھ رہے تھے "اس ہوٹل کے جو مالک تھے ولی وہ کہاں گئے؟"

"ہوں گے جی کہیں" اس نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

"اس جگہ سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں، میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں ------" ابا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"پاکستان؟ ----" اس مجسمے نما سکھ کی مچی مچی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں "کبھی راولپنڈی رہے ہو جی؟ میرا وطن ہے جی ----" اس نے کہنا شروع کیا۔

"ولی کا لڑکا تجن ہمارا ہم عمر تھا ----" ابا دور کھوئے

ہوئے تھے۔

"میں نے تو جی پہلے خرید لیا تھا۔۔۔۔ کوئی فرق نہیں پڑتا جی، اب بھی آپ کا ہے، بیٹھیں چائے پئیں۔۔۔۔۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ابا سے ہاتھ ملانے لگا۔

"یہاں روزانہ شام کو ہماری نشست ہوا کرتی تھی، ہم، علیم، مرزا نعیم اللہ بیگ، ربانی صاحب، ضمیر۔۔۔ یہیں بیٹھ کر ماؤنٹ بیٹن کی تقسیم والی تقریر سنی تھی۔۔۔۔"

"جی راول پنڈی میں محلہ بنّی ہے نا جی؟ دیکھا ہے آپ نے؟ وہاں ہمارا گھر تھا، وہاں کے رہنے والے ہیں ہم جی۔۔۔"

ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ نہ جانے کس دھندلی یاد کی انگلی پکڑے چل رہے تھے۔ "وہ قہقہے، وہ زمانے اور یہ دیواریں۔۔۔۔" ان کا رُخ ہوٹل والے کی طرف تھا مگر اس کا بھی ذہن کہیں اور تھا "راول پنڈی جی۔۔۔۔۔ بڑا یاد آتا ہے جی۔۔۔۔" دونوں میں سے کوئی کسی کی بات نہیں سُن رہا تھا اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی بات سنا رہے تھے "ہم یہاں چائے پینے آتے تھے، سگریٹ چل رہے ہیں، مسلم لیگ کی سیاست اور خبروں پر بحث۔۔۔۔۔" "سڑک سے آگے چل کر تیسری گلی میں مُڑ کے تھا ہمارا مکان، محلہ بنّی۔۔۔۔" "شعر پڑھے جا رہے ہیں اور دھواں دھار بحث چل رہی ہے۔۔۔۔" "مکان سے

آگے جی اسکول تھا اس کے برابر امرت کور کا مکان ۔۔۔۔"

دو خود کلامیوں پر مشتمل یہ مکالمہ کھنچتا جا رہا تھا۔ طارق نے ابا جان کی آستین پکڑ کر کھینچی "ابو چلئے نا ۔۔۔۔"

"چلو، چلو ۔۔۔۔" ابا کے خیالات کو فورسڈ لینڈنگ کرنا پڑی۔ "سب بدل گیا ہے ۔۔۔۔" انہوں نے ہوٹل والے سے ملانے کے لئے ہاتھ بڑھایا، وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر گھگھیانے لگا "کبھی راول پنڈی جانا جی تو محلہ بنّی ۔۔۔۔"

طارق اور میں بہت بور ہو چکے تھے۔ ہم باہر آ کر دیکھنے بھالنے لگے۔ سامنے پیاز کے چھلکے ڈھیر تھے جن پر ایک گائے منہ مار رہی تھی اور بندر جگہ جگہ جھول رہے تھے۔ ان بندروں کا بھی ہم سے کوئی تعلق تھا؟ ماضی بعید کی ایک اور نشانی جس حالت کو ہم اب نہیں لوٹ سکتے تھے؟

بھوپیندر چاچا اور ابا جان باہر نکلے۔ ابا جان ابھی تک اپنے پرانے ساتھیوں کی رول کال لئے جا رہے تھے "فلاں کہاں ہے، ڈھکاں کیا کر رہا ہے۔ ایک نام پہ آ کر وہ رک گئے "شفاعت؟ اور شفاعت کہاں ہے؟"

اس نام سے ہم بھی واقف تھے۔ ابا کی پرانی البم میں بھوری بھوری تصویروں میں گول عینک لگائے قمیص پاجامہ پہنے دھندلی سی شبیہہ ۔۔۔۔ ابا کے پھپھی زاد بھائی تھے یا ماموں زاد؟

"شفاعت تو مر گیا"

"ارے!" ابا جان جیسے سُن ہو کر رہ گئے۔

بہت دیر تک کسی سے بولا نہ گیا۔ آخر بھوپیندر چاچا نے خاموشی کو توڑا "شفاعت کے بیوی بچے یہاں ہیں، ان سے مل آؤ۔۔۔۔"

دو کمروں کا چھوٹا سا مکان جہاں ہمارے آنے سے ہلچل مچ گئی۔ بچّوں کی فوج گیند بلّے پھینک کر ہمیں دیکھنے آگئی اور بڑی بوڑھیاں غرارے پھڑکاتی اندر سے نکل آئیں، کوئی بلائیں لے رہی ہیں اور کوئی پاکستان میں پیاز کا بھاؤ پوچھ رہی ہیں۔ امّائیں اپنے بچّوں کو دکھانے لگیں "لئے چھٹن اسلم تایا کو چھام کرو"

"تایا ابا مام، تایا ابا چھام۔۔۔۔"

طارق اور میں ایک طرف کھڑے پُر تفنّن نظروں سے اس شناختی پریڈ کو دیکھ رہے تھے۔ "جاؤ تم دونوں اپنے کزنز سے ملو، دیکھو بھالو" ابا جان نے ہم سے کہا۔

ہم مکان کے اندر چلے آئے جہاں ہمارے ہم عمر کئی لڑکے بالے جمع تھے اور بحث کر رہے تھے کہ اب کی عید میلاد النبی کے جلسے میں خورشید نے اچھی نعت خوانی کی تھی یا پچھلی مرتبہ جُنید نے۔ ہم ایک طرف کو بیٹھ گئے اور ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان

Scanned with CamScanner

سے کیا بات کریں۔ طارق نے انہیں چیونگم نکال کر دی تو ایک نے لے کر جیب میں ڈال لی اور دوسرے نے چبائے بغیر نگل لی۔

"بیک ورڈ ۔۔۔۔" طارق نے میرے کان میں کہا۔ اور دوسری طرف "اولڈ کنٹری" کے یہ رشتے دار بھی ہماری قلب ماہیت دیکھ کر حیران نظر آ رہے تھے کہ یہ جو جینز اور ٹی شرٹ پہنے، گلے میں کیمرے لٹکائے، چیونگم چباتے، ٹورسٹ بنے چلے آ رہے ہیں یہ ہمارے رشتے دار ہیں؟ آنگن میں کئی بڑھیاں پاندان کھولے بیٹھی تھیں، وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔ کلّوں میں پان دبا کر وہ ہم سے سوال پوچھنے لگیں۔ ماتھے پر تیوری، تیوری پر ناک، اور ناک پر عینکیں چڑھا کر انہوں نے ہمیں سر سے پیر تک گھورا "اچھا تم اسلم میاں کے لڑکے ہو؟ کون سی جماعت میں پڑھتے ہو شاباش! کے لڑکے ہیں تمہارے باوا کے؟ بہن کوئی نہیں تمہارے؟"

مجھے کوفت ہونے لگی۔ یہ مَسلے ہوئے سوتی غراروں میں بکری جیسی ٹانگیں، رنگ اُتری ہوئی شیروانیاں، چوڑی دار پاجامے، پان میں رنگے ہوئے دانت، دیواروں پر پچکاریاں، کھُردری چارپائیاں، کمروں میں لٹکے چھینکے، لوٹے، کورے مٹکے ۔۔۔۔۔ مجھے کراچی میں کھوکھراپار، ملیر، لالو کھیت اور گولیمار جیسے گنجان آباد علاقوں میں رہنے والے رشتے دار

یاد آنے لگے جن کے چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں ان کی کثیر العیالی
ٹھنسی ہوئی تھی، جن سے ہماری ملاقات شادی بیاہ یا غمی کے
علاوہ اگر کہیں اور ہو جاتی تو وہ شرمندہ ہو رہتے اور ہم
جھینپ جاتے ۔۔۔۔۔۔ جن سے زیادہ شناسا چہرے ان کزنز کے
تھے جو یورپ یا کینیڈا میں سیٹل ہو چکے تھے حالانکہ ان سے ملاقات
تین چار سال سے پہلے نہ ہو سکتی تھی۔

ہم اُٹھ کر ابّا کے پاس چلے آئے۔ "ابّا جان اب چلیں" طارق
نے ان سے کہا۔

"کیوں، ابھی سے؟"

"نہیں بس اب چلیں ۔۔۔۔ بہت ہو گیا"

"تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

"اسی کی آپ اتنی تعریف کرتے تھے؟ ۔۔۔۔" طارق نے
پوچھا "یہی دِکھانے لائے تھے ہمیں؟ یہ قصبہ؟ ۔۔۔۔"

ابّا جان نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ بیٹے اور باپ کے
درمیان ایک ہرا بھرا باغ تھا جس میں شاخیں خشک ہوتی جا رہی
تھیں اور سوکھے پتّوں کا ڈھیر بڑھتا جاتا تھا ۔۔۔۔۔

(۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا

"کشف المحجوب" میں اُس چوہے کا حال پڑھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ لکھا تھا۔

"در ہندوستان دیدم کہ در زہر قاتل کرمے پدیدار آمدہ بود و زندگی کرمِ بدان زہر بود، ازاں چہ کلیت وی ہمہ آن بود، و در ترکستان دیدم بشہرے بر سرحدِ اسلام کہ آتش اندر کوہی افتادہ بود و می سوخت و از سنگ ہائے آن نوشادر میجوشید و اندر میان آتش موشی بود چوں از آتش بیرون آمدی ہلاک شدی"

میں نے اس چوہے کا حال پڑھا اور سوچ میں پڑ گیا..... چوہا جو آگ کے پہاڑ میں تھا۔

جس پہاڑ میں چوہے کا بِل تھا اس کی درزوں، چٹانوں کی ریخوں، پتھروں میں آگ بھری تھی۔ کثیف دھوئیں کا بادل پہاڑ کے اوپر پرچم کی طرح لہراتا۔ کسے اندازہ تھا کہ بظاہر خشک، سپاٹ نظر آنے والی اس زمین کی بُنیاد میں آگ کے طبقے ہیں۔ جب جوالا مکھی

پھٹا اور لاوا بہنے لگا تو چوہا مبتلائے ہراس ہوا۔ پتھروں کے سینے آگ سے روشن ہوئے، حرارت پھیلی تو چوہا سٹپٹا کر باہر نکلا اور گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ جیسے جیسے وہ دوڑتا جاتا پہاڑ کی آگ جُھلسائے دیتی۔

مگر عجیب بات ہے کہ اُس نے آگ کے پہاڑ سے نکل بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔

گاڑھا دھواں تمام میں پھر گیا، چٹانیں آگ سے چیخ رہی تھیں اور سنگریزے ٹوٹ ٹوٹ کر اُڑتے تھے، سیّال آگ طغیانی میں آئے دریا کی طرح بڑھتی پھیلتی ہر شے کو زیر کئے جاتی تھی۔ چوہا کبھی اِدھر جاتا کبھی اُدھر، کبھی آگے بڑھتا کبھی پیچھے ہٹتا۔ سارے میں ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے پہاڑ کے دہانے پر پہنچتا تو دائرے کے اندر گھوم کر لوٹ جاتا کہ کوئی قوّت تھی جو اسے آگ لگے وطن میں روکے ہوئے تھی۔ چٹان کی ایک پرت شعلوں کی حدّت سے پگھل کر جھڑی، پہاڑ سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی۔ اس کی کگر پر چوہے نے اپنے پنجے ٹکائے ہوئے تھے۔ چٹان سے نیچے اُترا تو ایک عجیب بات ہوئی۔ آگ کے پہاڑ میں وہ دوڑتا پھر رہا تھا اور زندہ تھا، پہاڑ کی آگ سے نکل آیا تو نکلتے ہی مر گیا۔

Scanned with CamScanner

اس چوہے نے مجھے سوچنے پر کیوں اُکسایا؟ پھر مجھے سُراغ ملا جب میں نے اپنے قدموں کی چاپ سُنی ــــــ خشک سپاٹ ریتیلی زمین پر بھاگتے ہوئے چوہے کے پنجوں کی کھرکھراہٹ ــــــ

====================

(۱۹۸۱ء)

برقی کتب

Scanned with CamScanner

غزالِ رمیدہ

چڑیا گھر سے ایک غزال بھاگ نکلا۔ غزال رہتے تو صحراؤں میں ہیں کہ ان کی وحشت کو شہر خوش نہیں آتے، اسی لئے چڑیا گھر میں سات غزال منگوا کر رکھے گئے تھے اور ان پر ٹکٹ لگایا گیا تھا کہ لوگ پیسے دے کر انھیں دیکھیں، ورنہ ان نایاب اور شرمیلے جانوروں کو پانا تو دور کی بات، انہیں دیکھنا بھی مشکل ہے۔ دشت کی وسعتوں میں جہاں تیز دھوپ کی چبھتی ہوئی کرنیں ریت پر موجِ سراب کی طرح جھلملاتی ہیں، غزالوں کی ڈاریں گھومتی رہتی ہیں، خوب صورت مگر چوکس، ہلکی سی آہٹ کا اشتباہ اور بھڑک اٹھے، پھر سمجھو خواب و خیال ہو گئے، اس سے پہلے کہ نظر انھیں پا سکے، کلیلیں کرتے قلانچیں بھرتے ہوا ہو جاتے ہیں۔ جہاں ابھی جھلک دکھائی دی تھی وہاں پہنچ کر دیکھو تو ان کا نشان نہیں، دور اگلی گھاٹی میں اُترتے غائب ہوتے نظر آتے ہیں، رفعتِ خیال اور آدرش کی طرح گریزاں، تعاقب کرنے والوں سے ہمیشہ ایک جست آگے۔

Scanned with CamScanner

چڑیا گھر کا رکھوالا غزالوں کو چارہ ڈالنے اُن کے باڑے میں آیا اور جالی کے دروازے میں اندر سے چٹخنی لگانا بھول گیا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر غزال بدکے، ان میں سے ایک پیچھے ہٹا تو اس کی پشت دروازے سے جا ٹکرائی جو پوری طرح بند نہ ہو سکا تھا۔ دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آیا۔ سنہری روئیں سے ڈھکا جسم لہرایا، چمکا اور چشم زدن میں غائب۔ رکھوالے نے چونک کر دیکھا ــــــ سنہری زقند کی جھل مل، برق رفتار پیروں کا اڑایا ہوا غبار اور دھوپ کی ہلکی آنچ پہ پگھلے سونے جیسا سیال بدن، اس کے ہاتھ احساسِ زیاں کے سوا کچھ نہ آیا۔ وہ غزال کے پیچھے لپکا، اسے آتے دیکھ کر غزال رم کر گیا۔ اب اِسے پکڑنا اتنا مشکل تھا جیسے سالِ گذشتہ کی برف اور بجھی آگ کے دھوئیں کو تلاش کرنا۔

مُدّتوں کی اسیری کے بعد کھلی فضا میں آ کر وہ جھجکا، ہوا میں ایک مانوس مٹھاس تھی جس سے اس کا خوف دور ہو گیا۔ گھاس کے قطعے، پھول، پتّے اور بیڑ دیکھ کر لپکا اور کلیلیں کرنے لگا۔ گھاس کُترتا، پھولوں میں منہ مارتا، خوشی سے اُچھلتا پھر رہا تھا کہ ایک رَوِش پر اچانک چڑیا گھر کے پاسبان سے سامنا ہو گیا۔ یوں آمنے سامنے آ کر دونوں چونکے، گھبرائے، پاسبان نے زور سے سیٹی بجائی کہ غزالوں کا اس طرح آزادہ

روی سے پھرنا خلافِ قانون ہے۔ بھلا غزال کو اصولوں کے بارے میں کیا پتہ تھا، وہ ڈر کر ایسا بھاگا کہ ایک چھلانگ میں چڑیا گھر کی دیوار پار۔

آگے سیدھی سڑک تھی، اس پر وہ ٹہلتا ہوا چلا۔ ذرا آگے اسے ایک پھاٹک کے اندر گھاس نظر آئی اور اس نے اندر جھانکا۔ کوٹھی میں خان بہادر فخر الزماں خاں حسرت بھری نظروں سے دیوار پر لگی کھالوں اور اپنے شکار کئے ہوئے جانوروں کے سر دیکھ رہے تھے جنہیں ٹرافی بنا کر وہاں نصب کروا دیا گیا تھا۔ دن بھر ان کا مشغلہ یہی تھا کہ آنے جانے والوں کو شکار کے کارنامے سُناتے رہتے، نوکروں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے یا اپنی وھیل چیئر پہ بیٹھے بیٹھے مُردہ جانوروں کے سَر دیکھے جاتے۔ گھر بھی انہوں نے اسی غرض سے چڑیا گھر کے پاس لیا تھا کہ جانوروں کی آوازیں سنائی دیں اور جب رات گئے شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی تو ان کے مفلوج جسم میں ناکارہ اور بے بس طیش پھنپھنا کے رہ جاتا۔ انہوں نے اپنے لان میں گھومتا ہوا چوپایہ دیکھا اور کچھ دیر یقین نہ آیا۔ وھیل چیئر چلاتے ہوئے وہ دوربین لے کر آئے تاکہ دیکھ سکیں یہ چیتل ہے، چکارا ہے یا کالا ہرن۔ پہچان لینے کے بعد انہوں نے اپنی بندوق اٹھائی جو ہمیشہ ان کے سرہانے گولیوں سے بھری تیار رہتی مگر مدت سے صرف نوکروں کو دھمکانے کے

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned with CamScanner

کام کی رہ گئی تھی۔ لبلبی دبائی اور بھاگتے ہوئے غزال کے کانوں پر سے گولی سنسناتی ہوئی نکلی۔

بھاگتے ہوئے غزال کو ایک بچّے نے دیکھا اور پکڑنا چاہا۔ "آہا جی کیسی اچھّی بکری ہے۔ ہم لیں گے، ہم پالیں گے اُسے۔" بچّہ اس کے پیچھے ہُمک کر آیا مگر غزال کو نہ پکڑ پایا، بچّہ روتا رہ گیا۔

اور غزال وہاں سے بھاگا۔ مکانوں اور سڑکوں اور لوگوں سے حیران، کبھی اِدھر جائے کبھی اُدھر، سڑک کے کنارے ایک احاطے سے ہوتا ہوا نکلا تو ایک مُشاعرے میں گھُس گیا۔ اب اسے کیا خبر کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، مشاعرہ کن تہذیبی روایات کا امین ہے، شعر کس چڑیا کا نام ہے اور داد کیسے دی جاتی ہے۔ وہاں نظم کا دور چل رہا تھا اور شکستہ زینوں، زنگ آلودہ پائپ کے ٹکڑوں، ٹوٹے ہوئے فرنیچر اور پلاسٹر اکھڑی دیواروں کے بارے میں سچّی دھات کی طرح کھنکتی ہوئی نظمیں پڑھی جا رہی تھیں، جو بے حد خوب صورت تھیں۔ غزال مشاعرے میں کریش (CRASH) کر گیا تو سارے شاعر اچنبھے میں پڑ گئے۔

اب اس کے پیچھے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے کیونکہ بھاگا ہوا غزال روز روز دیکھنے کو نہیں ملتا۔ لوگ اس کی خوب صورتی اور شوخی پر حیرت کر رہے تھے۔ کچھ یوں ہی تجسّس کے مارے آگئے

تھے اور بعض اسے حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو بس اسے پکڑ ہی لیا تھا۔ محلّے کے قصائی نے جو سالم غزال کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ دل ہی دل میں اس کے تکّے کباب اور بوٹیاں بنانے لگا۔ اس نے غزال کی گردن ناپ ہی لی تھی کہ وہ پھڑک کر اس کی گرفت سے نکل آیا ـــــ لیکن وہاں ایک پوست انباز اس ارادے سے کھڑا تھا کہ اسے پکڑ کر اس کی کھال کھینچ لے اور اس میں بھُس بھر کر اسے بیچ سکے۔ اچھا خاصہ تماشہ بن گیا اور غزال مجمع میں گھِر گیا۔ گلی کا کُتّا غرّاتا ہوا اس کی طرف لپکا کہ یہ کون اجنبی جانور اس کی حدود میں در آیا اور اس کی ٹانگ میں دانت گاڑ دیئے۔ غزال تکلیف سے بلبلا کر اُچھلا اور ایک ہی زقند میں مجمع سے پرے نکل گیا جیسے ایک معجزانہ جست کے ذریعے شاعر روزمرہ زندگی کو پار کر کے تخیّل کی دنیا میں جا پہنچتا ہے۔ مگر وہ جاتا کہاں؟ بھاگے ہوئے غزال کے لئے یہاں کہاں جگہ تھی۔ اُس نے حیرت سے سر اُٹھا کر دیکھا، نہ زمین کا نم تھا نہ آسمان کی روشنی، دھوپ اندھی بھکارن کی طرح گلیوں گلیوں ٹٹولتی پھر رہی تھی، زمین نے لمبے سایوں کی بکل مار لی تھی جنہیں وہ پہچانتا نہ تھا کہ صحرا میں عمارت ہوتی ہے نہ دیوار۔ زمین پر گھاس کا تنکا تک نہ تھا اور اکثر ایسی لمبی سیاہ کھُردری پٹیاں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے لاوے سے جلی زمین۔ ٹریفک کے ہجوم میں

ہارن بج اُٹھے ، بریک لگنے لگے ، گاڑیوں کے پہیے چرچرائے ، وہ بیچ سڑک میں رُک گیا اور گاڑیوں کے نیچے آتے آتے بچا۔ وہاں سے آیا تو دوسری طرف لوگ اسے پکڑنے کو جال لئے کھڑے تھے۔

اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور کان پھڑپھڑانے لگے۔ ہر چیز بہت پیچیدہ تھی اور اس پر چیتے کی طرح گھات لگا کر لپکتی تھی۔ اس نے بھاگنا چاہا، اگلی ٹانگیں اُٹھیں، بدن جُھکا اور ٹانگیں اٹھتے اٹھتے جواب دے گئیں۔ وہ ڈھیر ہو گیا۔

میں وہاں سے گذر رہا تھا مگر رُک گیا اس کی گیلی گیلی ڈبڈبائی بڑی بڑی آنکھوں کی سوگوار غُربت میں دم توڑتی شعریت پڑھنے کے لئے۔

(۱۹۸۰ء)

Scanned with CamScanner

ناقۃ اللہ

"چنانچہ ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی کا صریح معجزہ دیا، پھر بھی انہوں نے نہ مانا اور اسے ستایا یہاں تک کہ اس کو ہلاک کر دیا....."

القرآن ۱۵/۱۷ —— ۵۹

اونٹنی کھلا معجزہ تھی۔

آؤ تم سے بہت عمدہ قصہ بیان کریں کہ اس سے پہلے تم اس سے بے خبر تھے۔ کندھوں پر اُس نے چادر لپیٹی اور بستی والوں کو پکار کر اکٹھا کیا اور سب جمع ہو لئے تو انہیں ایک ماجرا سنایا۔ اس نے بتائی انوکھی باتوں کی حیرت، پھر اس نے ذکر کیا دہشت کا۔ مگر انہوں نے اس کا اعتبار نہ کیا۔ وہ بولے کہ تو، تو ہمارے جیسا ہے اور کیوں کر ہم اس شخص کی پیروی کریں جو ہم میں سے ہے اور اگر ایسا کریں تو بے شک ہم گمراہی میں پڑیں، ہم میں سے کیا اس کو الہام ہوا ہے؟ ہو نہ ہو یہ شخص جھوٹا اور ڈینگیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اُنہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور اس سے نشانیاں طلب کیں کہ ناموں کے معنی بتائے تاکہ ہم کو تسلی ہو۔

اس نے انہیں دکھائیں گھاس کی پتّیاں، خاک کے ڈھیلے اور دروازے جو ہنوز کھُلے نہ تھے۔ اس پر انہوں نے کہا یہ تو گھاس ہے اور خاک اور بند دروازے۔ ہمیں معجزہ دِکھلا۔

اس نے کلام کیا اے میری قوم حذر کرو کہ معجزہ دیکھنے والوں پر بھاری ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

آخر کار اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لئے وہ ایک پتّھر کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا جو مدّتِ مدید سے وہاں دھرا تھا اور اس کی خاموشی سے کلام کرنے لگا۔ پتّھر میں لکیریں اُبھری تھیں اور عجب نقشے بناتی تھیں جیسے دیوار سے اُکھڑتے پلستر، چٹانوں کی دراڑ، برساتی سیلن کے بھیگے نشان، فرش پر تیل کے چکتّے، دیوار پر دھوئیں کی کالک، ٹھیرے پانی کی سطح پر کائی کونے کھُدروں میں پھپھوند اور سفید کاغذ پر سیاہی کے دھبّے میں اشکال مرتّب ہونے لگتی ہیں۔ دیکھتی آنکھوں کے سامنے لکیریں چلنے لگیں، ایک لمبی لکیر کھنچتی چلی گئی جیسے اس کو پیر لگ گئے ہوں اور اس میں سچ مچ پیر نکل بھی آیا، ایک لکیر اوندھ گئی کوہان کی طرح، ایک لمبوتری تھی کہ دور سے تھوتھنی معلوم ہوتی تھی، ایک لکیر دُم کی طرح ہلنے لگی اور ایک جو تھی آنکھ کی طرح چمکتی تھی۔ پتّھر کے

Scanned with CamScanner

اوپر اونٹنی کے نقوش اُبھرنے لگے، لکیریں مل کر ایک شبیہہ بنانے لگیں اور اونٹنی کا روپ دھار لیا۔ تصویر مکمل ہوگئی تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھر میں سے اونٹنی نکل آئی۔ وہ اُونٹنی کھُلا ہوا معجزہ تھی۔ اور رنگت اُس کی پہاڑی نمک جیسی اور چال ایسی کہ چھم چھماتی بدلی برستی برساتی نکل جائے۔ جس نے دیکھا دانتوں میں انگلی داب لی۔ ایک نے دیکھا دوسرے سے کہا، ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی، شہر بھر میں شُہرہ ہوگیا۔ تمام خلقت اونٹنی دیکھنے اُمڈ پڑی۔ اُنہوں نے دیکھا اور تعجّب کیا کہ یہ اونٹنی پتھر میں سے نکلی جس کے بارے میں کسی کو گمان نہ تھا کہ اُس میں مُضمر ہوگی۔ وہ اس کے گرد بھیڑ لگا کر جمع ہوگئے اور اس پر حیرت کرنے لگے۔

اور بستی والے اونٹنی کے گرد جمع ہوکر اس کی تعریف کرنے لگے تو چادر کندھوں پر دُہری کرتے ہوئے اس نے دو ہتڑ سینے پر مارا اور نعرہ بلند کیا جان لو وہ وقت آن پہنچا کہ جانوروں کی صورت میں علامات کا ظہور ہو رہا ہے۔

اونٹنی جو چلی تو ایسا بھلا لگا کہ نمک کا ٹیلا ٹھُمکتا جاتا ہے اور لوگ اس کے پیچھے ہو لئے کہ حیرت کرتے تھے اور خوشی مناتے تھے۔ اُس نے بستی والوں کو پکار کر اکٹھا کیا اور سب جمع ہو لئے تو ان سے اقرار لیا کہ اونٹنی کے پانی پینے کی ایک دن

باری ہے اور ایک دن تم کو باری مقرر ہے اور نہ کیجیو بُرا ورنہ پھر تمہارے لئے بُرے دن کی پکڑ ہے کہ یہ اونٹنی اللہ کی ہے۔

تب اُنہوں نے ٹھیرایا کہ ایک دن پانی پر وہ جاوے اور ایک دن اور لوگوں کے جانور جاویں۔ اونٹنی پتھر سے نکل کر چھٹی پھرتی تھی، جس جنگل میں چرنے جاتی جانور وہاں سے دور ہو جاتے اور جس تالاب پر پینے آتی دوسرے تھم جاتے۔ بستی کے وسط میں تالاب تھا کہ جس سے سارے لوگ ضرورت بھر پانی لیتے تھے، اونٹنی وہاں آئی اور سب پانی اس کا پی لیا۔ تب چادر والے نے قوم سے کہا کہ تم دودھ دوہ کے پیو، پس انہوں نے اس کا دودھ دوہا اور پیا اور پی کر سیر ہو گئے۔ دودھ اتنا وافر تھا کہ کم نہ ہوا اور وہ دودھ کے گھڑے اور مشکیں بھر بھر کے لے جانے لگے۔

ان کو ہدایت تھی کہ پانی ایک روز اونٹنی کا ہے جس دن دودھ دوہا جاوے اور ایک دن ان کا ہے جس دن دودھ نہ دوہا جاوے۔ اونٹنی کے دودھ سے مکھن اور گھی جمع کر کے شہروں میں لے جا کے بیچتے تھے اور اس سے فائدہ حاصل کرتے تھے اور اس کے سبب سے تونگر ہوئے۔ اور وہ اونٹنی ان کے لئے برکت تھی۔ باری کے دن وہ پانی پینے آتی اور باری کے دن اسے دوہا جاتا، اور جدھر سے وہ گذرتی اس کو احترام و محبت سے دیکھتے اور

جہاں وہ جاتی بستی کے بچے اور بڑے اس کے پیچھے پیچھے چلتے۔ پھر روز روز اونٹنی کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ اس سے مانوس ہو گئے اور اس میں ان کے لئے کوئی اچنبھا نہ رہا۔ بستی کے بچے دوسرے کھیلوں میں لگ گئے اور بڑوں کو بہت سے کام تھے۔ اونٹنی اپنے طریق پر کھلی پھرتی تھی اور تالاب سے پانی پیتی اور ان کے راستے میں کبھی آجاتی تو وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ جاتے۔ پھر وہ اونٹنی سے بے زار آگئے۔ اونٹنی راستے میں نظر آجاتی تو اپنی جگہ کھڑے رہتے یا چلتے جاتے اور اونٹنی کو ان کے لئے رُکنا پڑتا۔ اونٹنی کو آتا دیکھ کر منہ پھیر لیتے اور بڑبڑانے لگتے۔ اونٹنی تالاب کا پانی پی جاتی تو انہیں بہت کھلتا کہ باقی جاندار پیاسے ہیں اور اونٹنی نرم کونپلیں بھی تمام چبا جاتی ہے۔ پہلے پہل دبے دبے لفظوں میں، پھر کھلے بندوں کہا جانے لگا۔ اونٹنی کی ناگواری ان کے دلوں میں بس گئی، اور اُس کا شوق جو انہیں تھا دریا کی طرح اُتر گیا۔ اپنے آپ سے اور مویشیوں سے اونٹنی کی برتری پر وہ کُڑھنے لگے اور بھول گئے کہ ان کو جتلایا گیا تھا کہ اونٹنی تمہارے لئے برکت ہے اس کو آزار پہنچاؤ گے تو حیات تمہاری تین دن کے سوا باقی نہ رہے گی کہ پہلے روز روپ تمہارا سُرخ ہو جاوے گا دوسرے روز زرد اور تیسرے دن سیاہ ہووے گا۔

Scanned with CamScanner

پھر کڑکتی چیخ تمہیں آلے گی۔ مگر وہ اپنا وعدہ بھولے اور اونٹنی سے جھنجھلانے لگے اور طرح طرح اس کو ستانے لگے۔ ان کے سلوک سے خفا ہو کر اونٹنی کا بچہ اسی پتھر میں لوٹ گیا جہاں سے اونٹنی نکلی تھی۔ ایک روز اونٹنی جنگل چر کے آتی تھی کہ ان میں سے ایک جو زیادہ دلیر تھا آگے بڑھا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ کونچیں کٹنے سے اونٹنی معذور ہوئی اور نیچے گر پڑی۔ اونٹنی کو گرتا دیکھ کر انہوں نے خوشی کا نعرہ مارا گویا انہیں نجات مل گئی ہو، اور تیر بھالے نیزے لے کے اس پر پل پڑے۔ نیزے چبھو چبھو کے اسے مار ڈالا اور ذرا دیر میں اس کی تکا بوٹی کر دی۔ اس کو مار کے انہوں نے گوشت کے پارچے الگ کئے اور آگ پر بھوننے کو رکھ دیئے۔

اونٹنی کے مارنے کا وہ جشن منانے لگے۔ آگ پر اونٹنی کے گوشت کے پارچے بھُنتے تھے اور اس کے گرد بستی والے جمع تھے اور ڈھول تاشے بجاتے تھے اور خوشی سے ناچتے تھے۔ جب گوشت اچھی طرح بھُن گیا تو اس پر انہوں نے کتری ہوئی پیاز ڈالی اور آپس میں تقسیم کیا اور ہر ایک کو اس میں سے حصّہ ملا اور سبھوں نے اس کو کھایا اور کھاتے میں شراب کے پیالے بلند کرتے اور خوشی سے نعرے مارتے۔

Scanned with CamScanner

اس نے اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی کے قتل کا جشن مناتے
دیکھا تو کندھے سے چادر کھول ڈالی اور عذاب میں مبتلا
کرنے والی چیخ سننے کے لئے کان زمین پر لگا دیئے۔

(۱۹۸۱ء)

Scanned with CamScanner

کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

شرم الشیخ

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝

القرآن

مُدت سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ ریگستان میں بھٹکنے والے بارش کو ترس گئے تھے۔ سوکھی زمین پیاسے ہونٹوں کی طرح خشک ہو کر چٹخنے لگی تھی۔ گیہوں کی بالیاں سوکھ گئی تھیں اور جانور دُبلے ہو رہے تھے۔ جو بچہ پیدا ہوتا کم آبی سے خوار ہوتا۔ بادلوں سے خالی آسمان کی رنگت جلے تانبے کی سی تھی اور اہلِ قبیلہ یوں بارش کی اُمید میں تھے جیسے کسی آیت کے نزول کی توقع میں، مگر وحی تو بند ہو چکی تھی۔ آخر دس افراد ان میں سے برگزیدہ و چُنیدہ اس شخص کے پاس گئے جو اچھے وقتوں میں جانوروں کے ذبیحے پر قربانی کی دُعا پڑھا کرتا تھا۔

اس شخص نے انہیں آتے ہوئے دیکھا تو مراقبے سے سر اُٹھایا اور پوچھا "کہو تابوتِ سکینہ کی خبر لائے ؟"

انہوں نے انکار کیا اور کہا "ہم باران رحمت کو ترس گئے ہیں۔ اے شخص ہمارے واسطے دعا کر کہ ہمارے گلے مرے جاتے ہیں۔"

اس شخص نے ان کا جواب سُنا اور ایک نعرہ افسوس کا بلند کیا کہ وائے ہمارے حال پر کہ ہم کو تابوتِ سکینہ ملا اور ہم سے چھن گیا۔

اور احوال تابوت سکینہ کا یہ ہے کہ ایک صندوق اُن میں چلا آتا تھا جس میں عہد عتیق کے تبرکات تھے، موسیٰ کا عصا، ہارون کا عمامہ اور تُرنج جو آسمان سے اُترتے تھے، اس میں سے ایک آواز آتی تھی اور قفل اس کے مضبوط تھے کہ جب کوئی مشکل وقت آپڑتا تو سردار اس کو آگے آگے لے کر چلتے اور دشمن حملہ آور ہوتا تو اسے سامنے دھر لیتے کہ اس کی برکت سے فتح نصیب ہوتی اور اقبال بلند ہوتا اور وہ صندوق جس میں ان کے پروردگار کی طرف سے دل جمعی تھی، ان سے گم ہوگیا۔ اس کے جانے سے سلطنت کا نشان مٹا اور نبوت بند ہوئی۔ اب ان میں بادشاہی نہ رہی کہ گھر میں چین سے بیٹھ پائیں اور نہ کوئی رسول آتا کہ ان کے حق میں کلمۂ دعا کہے، سب غریب و عاجز ہوئے۔ تابوت چھننے کے بعد ریگستان میں ان کا بھٹکنا شروع ہوا۔

اس شخص نے زمین پر سے خاک اُٹھا کر اپنے سر میں ڈالی

اور گریہ کیا کہ ولئے تمہارے حال پر جو تابوتِ سکینہ کی بازیافت نہیں کر سکے جانوروں کے مرنے کا افسوس کرتے ہو۔

مگر انہوں نے پھر ابر کا سایہ مانگا۔ اس نے مُناجات کی آواز آئی اور حکم ہوا کہ اے شخص اس میدان میں جو پتھر ہے اس پر اپنا عصا مارتب مائع بہے گا اور سیرابی ہو گی۔ اس نے اپنا عصا پتھر پر مارا۔ ضرب پڑتے ہی خشک زمین سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ اور اُس نے بارہ دفعہ عصا مارا اور بارہ چشمے جاری ہوئے۔ گاڑھا مائع ابلنے لگا، سونے سا سیاہ سیال کہ جس کے دم قدم سے صحرا میں رونق ہوئی، روشنیاں جل اٹھیں، پہیئے گھومنے لگے۔۔۔۔

صحرا میں چشمے جاری ہوئے تو وہ آسودہ ہوئے اور اس قدر کہ مُطلق بھول گئے اُن سے طالوت نے کہا تھا جو اس چشمے سے سیراب ہو وہ ہم میں سے نہیں۔ اور احوال طالوت کا یہ ہے کہ مِثل ان کے اُن کا بھائی تھا قد جس کا نشانی کے عصا کے برابر تھا اور صورت میں اس کی کُھلی بشارت تھی۔ طالوت کی ممانعت انہوں نے بُھلائی اور چشموں کا تیل ان کو آبِ حیات ہوا۔ اور جس نے ایسا کیا اس پر پیاس غالب ہوئی، چشمے سے پلٹا تو پیٹ ایسا اُبھر گیا کہ اپنی چال بھولا اور جسم تمام سونے کے ورقوں سے ڈھک گیا۔ عمامہ قبا سنبھالتا چلا تو باوردی شوفر نے مرسیڈیز آگے لاکر آہستہ سے روکی اور سلام کر کے دروازہ کھولا۔ او ہو بہت

دیر کر دی ۔۔۔۔۔" ڈرائیور کو جھڑکتا ہوا وہ اندر بیٹھا اور کلائی پر بندھی ڈجیٹل گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تیز چلاؤ ۔۔۔۔۔" گاڑی ہائی وے پر پھسلتی ایرو ڈروم پہنچی، وہ مرسیڈیز سے اُترا اور جمبو جیٹ ڈی سی ۱۰ کی آرام دہ سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ کر ایئر ہوسٹس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے جھانکا کہ اسکائی اسکریپرز کے وسط میں وہ ملٹی اسٹوری پلازا نظر آرہا ہے جس کی کسی اونچی منزل پر اس کا ایئر کنڈیشنڈ آفس ہے۔ جہاں اس کا بگ بزنس انٹر پرائز تھوک کے بھاؤ پیٹرو ڈالرز اُگل رہا ہے۔

ایئر کنڈیشنڈ صحرا اُن کے لئے آسودگی بخش ہوا کہ بے فکر ہوئے اور غافل ہو گئے اور جو اپنی مسافرت اور غاصبین سے جنگ کا دھیان آتا تو وسوسے میں پڑ جاتے کہ وہ اپنے خلاف صف آرا ہیں اور ایسا معلوم ہوتا داؤد جس فوج کی سالاری کر رہے ہیں وہ دشمن کی سپاہ ہے اور وہ خود دراصل جالوت کے لشکر سے ہیں جن کے دیو ہیکل زرہ بکتر کے سامنے کوتاہ قامت داؤد کھڑے فلاخن میں پتھر گھما رہے ہیں۔ وہ کس جانب تھے انہیں یقین نہ تھا سوائے اس حنّاس کے جو بہت قوی تھا کہ وہ اپنے تئیں معجزوں والی اُمت گردانتے تھے۔ اور جنگ بھی ان کے لئے یوں ہو گئی جیسے قیلولے میں دکھائی دینے والا خواب۔

Scanned with CamScanner

اور وہ شخص جو خواب سُن کر تعبیریں بتایا کرتا تھا پہاڑ سے نیچے اترا تو اپنی قوم کو زر پرستی میں مبتلا پایا۔ اور احوال اس نے یہ دیکھا کہ مُدت پہلے اُن کی زمین پر وحی لانے والے فرشتے کا گذر ہوا تھا، اس کے گھوڑے کے قدموں سے خاک لے کر سونے کے بچھڑے میں ڈالی اور وہ جو بولا تو اس کو معبود اپنا ٹھہرایا۔ اس نے آکر دیکھا کہ وہ بچھڑے کے سامنے سجدے میں گرے ہیں اور گئو سالہ بول رہا ہے "یا اخی سونے کی پوجا کرو آؤ سرمائے کی پوجا کرو۔۔۔۔۔"

(۱۹۸۱ء)

بوڑھ کہانی

صرف بوڑھی عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔

ایک شہر تھا جو دنیا کے سرے پر پہاڑوں کے بیچ واقع تھا، اس پر سے آگ اور لہو کے دریا گذر گئے۔ لکھو کھا موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ شہر زور مرد قتل ہوئے، ننھے بچوں کے حلق پر چھریاں پھریں اور عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالی گئیں۔ شہر کی آبادی کچھ بھاگ گئی، کچھ لوگوں نے جان بچانے کو تبدیلیٔ مذہب اختیار کی اور کچھ غلاموں کی طرح بذریعۂ نیلام فروخت کئے گئے۔ کوچہ و بازار کہ علماء و فضلاء اور مضراب بجانے والوں اور داستان سنانے والوں کے لئے شہرت یافتہ تھے ویران ہوئے، گلیاں جن میں مہر و ماہ کا کٹورا بجتا تھا اُن میں خاک اُڑنے لگی۔ عبادت گاہوں میں ناقوس کی جگہ گدھے کے رینکنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ بے کفن لاشیں گلیوں میں پٹی پڑی تھیں، کوئی اتنا نہ تھا کہ ان پر کلمہ پڑھتا۔ گدھ اور کوّے اور مردار خور ایسے پیٹ بھرے ہوئے

کہ لاش پر منہ مارتے اور چھوڑ دیتے اور گیدڑ مُردے کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبا لیتے، باقی چھوڑ دیتے۔ مکانات و عمارات زمین کے برابر ہوئیں۔ جو زندہ بچے وہ قافلے بنا کر بھاگ نکلے، جو رہ گئے ان میں سے مَردوں کو قتل کر ڈالا گیا اور حملہ آور چودہ سے چوالیس سال تک کی عورتوں کو ہنکا کر لے گئے۔

تاخت و تاراج شہر میں باقی رہ جانے والی سٹھیائی ہوئی بُڑھیاں، لاٹھیاں ٹیکتی، گٹھریاں سنبھالتی، گھسٹتی رینگتی کھانستی کھنکھارتی، کانکھتی کراہتی چیختی چلاتی، سڑی بسی بڈھی نانیاں دادیاں۔

پہلے پہل انہیں پوری طرح اندازہ نہ ہو سکا کہ ہو کیا گیا۔ تجھے مجھے کوستی کاٹتی، اِسے اُسے برا بھلا کہتی، بکتی جھکتی پاندان کھولے پان لگاتی، چوکی پر بیٹھی چھالیہ کترتی رہیں دوپٹوں پہ لچکا اور لہنڈیوں میں پیاز کا بگھار لگاتی رہیں۔ بہت سے بہت یہی سمجھا ہو گا کہ دنیا کو اپنے سر پر اُٹھانے والی گائے نے سینگ بدل لیا ہے۔ لمبے دالانوں میں سفید چاندنیاں بچھا کر انہوں نے مرنے والوں کی فاتحہ دلوائی۔ سر ڈھک کر دعائیں مانگیں، چنے بتاشے پڑھے گئے اور پڑھے ہوئے سپاروں کا ایک طرف کو ڈھیر بن گیا۔ حاضرین سے عاری محفل میں اگر کی بتیاں سُلگ سُلگ کر خوشبودار دھوئیں میں تحلیل ہوتی رہیں۔ فاتحہ کے بعد

Scanned with CamScanner

اپنے اپنے گھروں کو جانے کے بجائے وہ ایک ایک کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

لوگوں سے خالی تباہ حال شہر میں بچی کھچی یہ سٹھیائی ہوئی لاوارث بڑھیاں جو گم شدہ قبیلوں کی طرح بھلا دی گئی تھیں، سردی اور سونے پن کے ہراس میں اور نزدیک سمٹ آتیں۔ بے چراغ عمارتوں میں یہ خبط الحواس بڑھیاں ممی مجسموں کی طرح معلوم ہوتیں، ایک سانچے کی بنی، ایک ہی مٹی کا خمیر، وہی بہت قافلوں اور لشکروں کے روندے ہوئے میدانوں جیسے جھریائے چہرے، ایک سے حلیے، آڑے تنگ پاجامے کلیوں والے کرتے اور ڈھائی گز کے دوپٹے جو سروں کو ڈھانپتے کندھوں پر پڑتے۔ سفید آنکھوں سے نہ جانے کیا تکے جاتیں، آپ ہی آپ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتیں اور چپکے چپکے دعائیں مانگتی رہتیں حتیٰ کہ ان کا سارا وجود ایک دعا بن جاتا، جو مر چکے تھے ان کے لئے فاتحہ اور ان کے لئے بھی جو پیدا نہ ہو سکے۔ وقت گذارنے کے لئے پرانے عزاروں شلوکوں پر سے گوٹا اُدھیڑنے لگتیں یا ہار سنگھار کی ڈنڈیوں سے زعفرانی رنگ بنانے لگتیں۔ بے خواب لمحوں کی لمبی جگار میں ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتیں، کبھی لگتا کہ رات کی آخری بس کھڑکھڑاتی چلی جا رہی ہے، کبھی غنیم لشکروں کی آمد سنائی دیتی اور کبھی گلیوں کی خاموشی کو مسافروں سے خالی رکشہ توڑتے ہوئے سنائی دیتے۔ کبھی وہ ایک دوسرے کی غم گساری

کرتیں، کبھی آپس میں جوتا چلنے لگتا۔ ذرا ذرا سی بات پر تیوریاں چڑھ جاتیں اور مٹھی میں بال پکڑ کر کھینچ ڈالتیں "مال زادی قطامہ قلما قنی شقتل نامراد گیسو بریدہ ------" خوب گالیاں کوسنے دہرائے جاتے، برتن اٹھا کے دے مارتیں، جوتیاں اُچھالتیں، دستی پنکھے سے پیٹ ڈالتیں اور لڑ بھڑ کر پھر مل بیٹھتیں، پان کی گلوریاں بنا بنا کر دینے لگتیں کہ ایک دوسرے کے علاوہ ان کا بچا ہی کون تھا۔ اور گلوریوں کی پیک تھوک کر بہت چاؤ سے اپنی گذری باتوں کے پٹارے کھولتیں، یادیں تازہ کر کے ان کی بازطلبی کرتیں------ اپنے حالات، گذرے واقعات پرانے در و دیوار، پرانی محبتیں، پرانی عادتیں، بیتی چیزیں ------

مدت بعد لوگ لوٹنے لگے، شہر میں آبادی کا نقشہ کھنچا، گلی کوچے پھر چہروں سے آباد ہوئے۔ ان میں سے کچھ وہاں کے پرانے باسی تھے جو لوٹ آئے تھے، کچھ کو آباد ہوتے ہوئے شہر کے نت نئے مواقع کھینچ لائے اور جو اس شہر میں آئے تھے ان میں سے بعض نیکوکاری و راستی سے بھٹک گئے تھے اور بعض کو اُداسی نے جا پکڑا تھا، اور انہی میں سے بعض ایسے بھی تھے جن سے ان بڑھیوں کی کہیں دور پرے کی عزیز داری نکلتی تھی۔ خس و خاک سے اپنی تعمیر میں مصروف شہر میں کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ان بڑھیوں کا کیا کیا جائے، لپ لپ کرتی کپلپاتی لپسی ہریرہ بڑھیاں، ایک پاؤں قبر میں لٹکائے

ہوئے پھر بھی اپنی باقی ماندہ زندگی سے پوری حریصانہ قوت کے ساتھ چمٹی ہوئی۔ کسی کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے رشتے داروں نے بھی انکار کر دیا کہ وہ ناخوش گوار گئے گذرے ماضی کی ان چچیری پھُپھیری ممیری خلیری صورتوں میں کہاں تک مغز کھپاتے۔ سب ایک جہانِ تازہ کی بنیاد ڈال رہے تھے، وہ ان خبطی بڑھیوں کا کیا کرتے۔ آخر کار شہریوں کی کونسل نے ان کی عمر اور لاچاری پر ترس کھا کر انہیں اصطبل نما ایک پرانی عمارت الاٹ کر دی حالاں کہ اس طرح انہیں وہاں کانجی ہاؤس جیسا مفید ادارہ بنانے کا منصوبہ ترک کرنا پڑا، مگر وہ اپنے ماضی کو اس کا جائز مقام دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا شہر بھر کی ساری پرانی دُھرانی بڑھیاں نکل پڑیں جیسے موسمِ بہار کی صفائی میں کونے کُھدروں سے کاٹھ کباڑ اور کوڑا نکالا جاتا ہے، اور اس عمارت میں یوں جمع ہو گئیں جیسے بربادی کے دنوں میں ہوئی تھیں۔ پہلے پہل وہ تیرے میرے گھروں گھستی پھریں کہ کوئی انہیں رکھ لے، ہر ایک کی ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈالنے لگیں کہ اے بٹوا بس ذرا سا کونہ، اتنی سی جگہ کہ میری پٹاری اور جائے نماز سما جائے، دعائیں دوں۔۔۔۔۔ لیکن بیرِ تسمہ پا کو کون جانے بوجھے گلے مڑھتا اور کہاں سے ان کے لئے وہ سب کچھ فراہم کیا جاتا جس کی ضرورت نئی زندگی کی تعمیر کرنے والے نوجوانوں کو تھی۔ چنانچہ شام گئے باڑے لوٹنے والے ڈھور ڈنگر کی طرح وہ

اس عمارت میں بھر گئیں اور شہریوں کی کونسل کو ہاتھ پھیلا پھیلا کر کوسنے لگیں "مولا کی تیغ ٹوٹے، بجلی گرے، قبر بجو گھسیٹیں، ہیضہ سمیٹے انہیں، الٰہی ہمارا صبر پڑے، اپنے پیاروں کو روئیں ......" اور اتنا چیخنے پیٹنے سے گلے بیٹھ گئے تو اپنے لئے پان بنانے لگیں۔ پان کھاتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے اپنی مشکلیں اور پریشانیاں اور اپنی اپنی اُفتاد کہنے لگیں، اور اب ان کے مسائل متداول سے ارتفاع حاصل کر کے مکاشفانہ ہو گئے تھے۔ وہ دور دیس کی باتیں سناتیں اور بیتے دنوں کی، رفتہ و گذشتہ کو دھیان میں لاتیں، ان طور طریق کا ذکر کرتیں جو اب متروک ہوئے اور ان لوگوں کا گمان جو کھوئے گئے ......

رات گئے ان میں سے کوئی جاگ اٹھتی اور پکارنے لگتی "آئیں بوا کہانی کہیں؟ ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانہ چڑا لایا چاول کا دانہ، دونوں نے مل کر پکائی کھچڑی، اور کھچڑی کھانے جو بیٹھے تو اس میں گھی نہیں، چڑیا بولی ....
اور کہانی کہیں؟ ایک تھی شہزادی، نام اس کا بنج پھلّا بادشاہ زادی، روز صبح سویرے نہار منہ پانچ پھولوں میں تُلتی تھی، پورے پانچ پھول نہ ایک کم نہ ایک زیادہ، کیا مجال کہ پانچ سے چھٹا پھول چڑھ جائے، تھی بھی پھولوں سی کہ ایک دن کرنا خُدا کا کیا ہوا ...... سُنتی ہو کہ سو گئیں؟"

کوئی ہنکارا نہ بھرتا تو کہانی رُک جاتی اور بُڑھیا آہستہ سے پوچھتی "ائے سب سو گئے؟" سب سو گئے

کسی کو خیال آتا کہ "ائے بیوی آج تو ساون کو جی چاہتا ہے۔ جہاں پھوار پڑی اور رس بوندیاں گرنے لگیں ساری گوئیاں اکٹھی ہو گئیں۔ گھٹائیں جھوم رہی ہیں، کوئل کوک رہی ہے، آم میں جھولے پڑ گئے، کڑھائیوں سے پکوان اُترنے لگے، جھولوں میں پینگیں بڑھ رہی ہیں، کوئی ملہار گاتا ہے کوئی ساونیاں کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری ساون آیا ۔۔۔۔۔ اور بسنت کس دھوم سے منتی تھی۔ جانیں اب بھی کوئلیں کوکتی ہوں گی کہ نہیں، لڑکیاں بالیاں گیتوں میں بھیا باوا کو یاد کرتی ہوں گی کہ نہیں، اب بھی آتے ہوں گے ساون اور بسنت؟" پھر نیند بھری آواز میں کوئی اپنی جیسی خستہ حال ماما اصیل چھوچھو انّا مغلانی کو ہدایات دینے لگتی کہ "اچھی دیکھنا فرش چاندنیاں بچھواؤ، آنگن میں چھڑکاؤ کرواؤ، عطر کی پھریریاں ہوں اور خاصدان آئے، پان کے بیڑے تیار رکھو، جیسے ہی کہار آواز دیں اور بی بیاں پالکیوں سے اُترنے لگیں گلاب پاش سے عطر گلاب چھڑکنا اور دسترخوان قرینے سے بچھا کر کھانے چُن دینا نرگسی کوفتے اور گاؤزبان اور شب دیگ اور متنجن اور شاہی ٹکڑے ۔۔۔۔۔ اے کہاں غارت ہو گئیں سب کی سب، کون زمین نگل گئی کون آسمان مٹا گیا؟ اب کہاں وہ انجمن وہ بزم کی رونق،

Scanned with CamScanner

محفلوں کی آرائش ، وہ مہندی لگے ہاتھ ، کاجل رچی آنکھیں ، ہونٹوں پہ لاکھے ، دانتوں پہ مستی کی دھڑی ، میدہ شہاب رنگ ، ہاتھوں میں چوڑیاں پیروں میں پائل ماتھے پہ جھومر ، کہاں ہیں وہ لب کہ مصری کی سی ڈلیاں اور بول کہ امرت کے سے گھونٹ ؟"

سب کھوئے گئے

کوئی اور بوڑھی عورت نیند سے چونک پڑتی اور یاد کرتی کہ وہ شہر پناہ وہ قلعہ اور باغ اور باؤلی کہاں گئے۔ وہ کیا ہوئے بڑے بڑے جھاڑ فانوس کنول طاق میں جلتے چراغ ، طلائی شمعدانوں میں کافوری شمعیں ، وہ آبدار خانے چاندی کی بھٹلیاں برنجی صراحیاں ، کیا ہوئے وہ دیوالی کے دیئے ، شب برات کا حلوہ اور آتش بازی کے انار ، عید کی سوّیاں اور عیدی کا سوا روپیہ ، علم تعزیئے ، ضریح اور دلدل کے قدموں کے نشان ، بی بی کا کونڈا ، مشکل کشا کا آسرا ، دعاؤں میں اثر دلوں میں چین زمین پہ فراوانی ------ وہ امام ضامن ، نیاز ، منّتیں ، عرس ، وہ قبروں کی چادریں وہ باپ دادا کی قبریں ، آبائی مکان ، کھجر کے پیڑ ، بزرگوں کی ہڈیاں ، وہ شہروں کی گلیاں ، گلیوں کی رونق ، تیج تیوہار ، چوک کی بہار ، پھول والوں کی سیر ، سلطان جیؒ کی سترہویں ، آٹھوں کا میلہ ، میلے ٹھیلے ، وہ سہرے کی لڑیاں کلائی کا کنگنا ، شگون کی مٹھائی ، نُقل ، وہ نوبت نقارہ ، ڈھولک تاشہ ،

منڈھا، وہ سانچق بَری، چوتھی چالے دولہا کے شہ بالے ---
کہاں گئے وہ مہندی اُبٹن صندل، وہ رسمیں وہ زمانے وہ ہر شے
میں نظم کی سی بندش۔

سب مر گئے

مردہ ماضی کے کھنڈر پہ بستے نو آباد شہر میں جمع یہ باسی تباسی
سوکھی سڑی مرگھلی کُبڑی چُندھی بڑھیاں اپنے زمانوں کا یوں ذکر
کرتیں جیسے گذرا ہوا وقت وہ روایات کا گمشدہ شہر ہو جو
دورِ ابتلا رمیں ذلت اور گمراہی سے بچنے کے لئے جھیل کی تہ میں
بیٹھ گیا تھا کہ زیرِ آب ان کو بہتر زیست ملی اور پاک تر، بہ نسبت
اس کے جو زمین پر تھی اور موسم گرما کے ایام الراس السرطان میں کبھی
کبھی کبھی چند منتخب لوگ جس کی گمشدہ کلیساؤں کی گھنٹیاں سن سکتے
ہیں اور پانی کے نیچے شہر کے چراغ جھلملاتے دیکھ سکتے ہیں۔

یہی بُڑھیاں اُس قبیلے کی طرح تھیں جس کے چند گِنے چنے افراد
باقی رہ گئے ہوں کہ ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے ساتھ وقت
اور تاریخ کا ایک اچھوتا جزو ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ ساری انہونی باتیں پہاڑوں کے بیچ واقع ایک شہر
میں ہوئیں جو دنیا کے ایک سرے پہ تھا۔

(۱۹۸۱ء)

Scanned with CamScanner

کہانی ختم

دورانِ سفر رات نے انہیں گھنے شہر میں آ لیا۔ اب ان کے قیام کی منزل یہی تھی۔

کئی دن سے برف کے تودے ان کے ساتھ ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ اونچی نیچی نکیلی ریٹیلی چٹانوں کا سلسلہ تھا جو ساتھ ساتھ آگے بڑھا آتا تھا، کارواں کے متوازی حرکت کرتا ہوا، سانپ لہریں بنا کر رینگتا ہوا ——— مگر اتنے فاصلے پر کہ ان کو نظر میں رکھ سکے۔ قلاش سورج کی بچی کھچی دھوپ میں ان چٹانوں پر جمی برف شیشے کی آنکھ جیسی عنبر طبیعی روشنی سے چمکتی۔ وہ نظر اُٹھا کر دیکھتے کہ میدان کی سپاٹ زمین دور جا کر پھیلتے پھیلتے چٹانوں کے ساتھ اوپر اُٹھنے لگتی ہے اور یخ بستہ آسمان اس کی جانب جھکا آ رہا ہے۔ برف پر سے روشنی کی کرنیں ست رنگے نیزوں کی طرح ٹکرا کر پلٹتیں، آنی کی طرح چبھتیں، جو دیکھتا آشوبِ چشم میں مبتلا ہو جاتا۔ وہ جتنے آگے جاتے، پہاڑ ساتھ موجود ہوتے، سنسان راستوں سے چلتے،

Scanned with CamScanner

پاٹ دار ندیوں اور تنگ گھاٹیوں سے گزرتے میں یہ سر بفلک پہاڑ انہیں خاموشی سے تکتے رہتے، کچھ نہ کہتے اور ساتھ چلتے رہتے۔ آسیب زدہ چاندنی کے نور میں شرابور راتوں میں جب خواب ستاروں سے آنسوؤں کی طرح ٹپکتے تو لگتا کہ وہ برف پوش سمٹ کر اور نزدیک آگئے ہیں، چند قدم کے فاصلے پر ہیں ان کی قربت کا احساس ذہنوں کو سُن کر دیتا اور خوف سے ہڈیوں میں گودا جمنے لگتا۔ صبح کے وقت پہاڑ دور کھسک چکے ہوتے اور کہرا پہاڑوں کا سانس بن کر میدانوں میں اُڑ رہا ہوتا ــــــــ پہاڑوں کی سردمہری یاد دلانی، کہ وہ ٹل تو گئے ہیں مگر قوت رکھتے ہیں اور بالآخر ان ہی پہاڑوں میں انجام ان کو بلا لے گا۔

تُند ہواؤں کے سپاٹ میدان میں وہ سردی اور خوف سے ٹھٹھرتے ہوئے سفر کر رہے تھے، پہاڑ شکاری جانوروں کی طرح ان کی گھات میں تھے اور ان کے پاس آگ اور روشنی کے لئے کچھ نہ تھا، سوا اُنہوں نے کہانی کہنے کی صلاح کی۔ میدانوں میں برف جمنے لگی تھی اور بوڑھے کی پُتلیاں بھی ساکت ہو گئی تھیں۔

بشارت کی صبح وادی میں پھول کھلے تھے۔ پھولوں پر گری شبنم کے آب دار موتی سے قطرے ان کی غذا تھے۔ ایک دن مٹی کے برتن گھڑتے گھڑتے بوڑھے کی نکسیر پھوٹ گئی اور لہو کی سرخی چاک میں گھل گئی۔ میدانوں میں الفلفا کی جگہ کُتا گھاس نے لے لی تھی

اور جانوروں کے دودھ میں تمباکو کا کسیلا ذائقہ اُترا ہوا تھا۔
جب تلواروں کی باڑھ سے نیام چھلنی ہو گئے تو ان پر سفر سوار ہوا۔
ان کو نئی چراگاہوں کی تلاش تھی مگر بڑے میاں بہت نستعلیق آدمی
تھے کہ اچھے دن دیکھے ہوئے تھے اور بھرپور زندگی گذاری تھی۔
سمندر کے نیچے ایک شہر تھا جس میں لوگ رہتے تھے۔ سمندر ان پر
عزّ اتا، چنگھاڑتا، سفید جھاگ دار موجوں کے تھپیڑے مارتا۔ وہ
شیشے کے مکانوں میں رہا کرتے تھے اور ان کے گھر پانی کے بلبلے
تھے۔ ان کے پاس سونا تھا اور مونگا، مگر ان کے پاس روٹی نہیں
تھی کہ شراب کے پیالے میں ڈبوتے۔ اس لئے ان کا بپتسمہ نہیں
ہُوا تھا۔ اس رات وادی میں شبنم کی جگہ برف گری۔ پھول ٹھٹھر
گئے، جانور مر گئے۔

بوڑھے کو حرارت رہنے لگی۔ ہر دوسرے تیسرے دن بخار
ہو جاتا۔ بہت کہنے سُننے سے وہ ایک دن دوا کھا لیتا اور اگلے وقت
دوا اُٹھا کر پھینک دیتا۔ برف کے پہاڑ ان کے ساتھ چل رہے تھے،
میدانوں میں برف پھیلتی جا رہی تھی اور سمندر بپھر رہا تھا۔ میدان کسی
طور سمٹنے میں نہ آتا تھا، نہ سفر میں پڑاؤ کی نوبت۔ پژمردگی اور
بوجھل تھکن کی سطح مرتفع دور دور تک پھیلتی تھی اور ٹانگیں جواب
دئے دے رہی تھیں۔ ٹوٹے جوتوں سے جھانکتے پیر پھوٹے آبلوں
کے لیس سے چپک رہے تھے۔ ایسے میں پہاڑ لمحہ بہ لمحہ قریب آنے لگے۔

Scanned with CamScanner

پہاڑوں کو گمان ہو گیا تھا کہ یہ کم زور پڑتے جا رہے ہیں، سردی سے دوہرے ہوتے ہوئے جسموں میں ہوا کا یخ بستہ لمس بھالے کی طرح گھُسا جاتا تھا۔ پالے نے چہرے کے بے حس اعضاء کو جما دیا اور انگلیاں گل کر جھڑی جاتی تھیں۔ پہاڑ بالکل سر پر آ چکے تھے۔ وہ رات بھر کے لئے شہر میں رُک گئے۔

ایک بے بنیاد شہر تھا جو پہاڑوں کی قربت اور جاڑے کی برفانی رات کے خوف سے اُگ آیا تھا۔ شہر میں رات بھر ویران گلیاں تنہائی کے درد سے چلّاتیں اور قبر ایسے مکان ویرانی پر پہرہ دیتے۔ اکّا دکّا راہ گیر بھی نظر نہ آتا اور رات گئے تک چلنے والی، سواریاں سناٹے کو چیرتی، کھڑکھڑاتی اپنے ٹھکانوں کو لوٹتی ہوتیں۔ سُرمئی رات میں ملفوف شہر اپنے خزانے اُگل رہا تھا؛ رنڈیاں، جیب کترے، لُوطی، زنخے، پیشہ ور خون فروش، شاعر، بے گھر، دیہاتوں کے مہاجر، شہر کے بچّے، رات کی آنکھیں۔ اتفاقاً انہوں نے ایک دوسرے کو نیم دائرہ بناتے ہوئے پایا۔ وہ وہاں بغیر کسی منصوبے کے جمع ہو گئے تھے، محض اتفاقاً۔ وہ سب آگ اور روشنی ڈھونڈھ رہے تھے۔ سڑک کے اگلے موڑ پر تین چار کوچوانوں نے آگ جلا رکھی تھی۔ وہاں گھوڑوں سے عاری تانگے کھڑے تھے اور ہوا میں گھوڑوں کے دانے کی بو تھی۔ سوئی عمارتوں نے بے حس رات کا دبیز کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ وہ سڑکوں پر پھٹے

Scanned with CamScanner

کاغذ، ردّی، پرانے اخبار، گُودڑ چُنتے پھرے کہ آگ روشن کریں، ہاتھ تاپیں، ٹھنڈے پڑتے لہو میں حرارت کی رَو دوڑے۔ خوابیدہ شہر کی کہُر آلود سڑکوں کے ٹھنڈے پتھروں پر وہ نیند کے جالے بنتے بگڑتے محسوس کر رہے تھے۔ بے مہر شہر ٹھنڈا اور بے آسرا تھا، اور سردی اتنی بڑھ گئی تھی کہ کلیجہ کانپا جاتا تھا۔ وہ بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

آگ مرتی جا رہی تھی اور سردی تھی کہ کسی طور کم ہونے میں نہ آتی۔ ہر جھونکا نکیلے ناخنوں سے بدن کھُرچتا، چہرہ نوچتا جاتا۔ سردی کے ساتھ ہاتھ پیر سُستی میں بند ہوئے جا رہے تھے اور کپکپاتے، ٹھٹھرتے جسموں میں خالی انتڑیاں بھوک سے غرّا رہی تھیں۔ خالی پیٹ جاڑے کا زور سہنا یوں بھی مشکل تھا۔ سب کو تھرتھری چھُٹی ہوئی تھی اور وہ ادھ بجھی راکھ کو بار بار کُریدتے تھے۔ کوئی باقی ماندہ لکڑی آگ پکڑ لیتی تو شعلے نیم دلی سے بلند ہوتے اور ہوا میں لہرانے لگتے، ان کے برفائے جسموں میں حرارت کی رو دوڑ جاتی۔ لپکتے شعلوں میں عمارتیں متزلزل نظر آنے لگتیں، معلوم ہوتا کہ شہر جل رہا ہے۔

خس و خاک کے شہر میں آتش پارے جگنوؤں کی طرح اُڑتے پھر رہے تھے۔ شعلوں کی زبانیں چھتوں کی بوسیدہ کڑیوں کو چاٹ گئیں تو پرانے مکان بدمزاج بڑھیوں کی طرح چرچرانے

لگے جنہیں نیند سے جگا دیا گیا ہو۔ جلتے شہر سے وہ بوڑھے کو اپنے کندھے پر لے کر بھاگا۔

پہاڑوں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا اور ہزاروں سال لمبی رات مایوسی اور غفلت کی طرح دلوں میں اُتر رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے اپنی پھٹی گدڑی اپنے کپکپاتے بدن سے لپیٹتے ہوئے کہا "یارو کوئی بات کہو کہ رات کٹے"۔ سو انہوں نے کہانی کہنے کی صلاح کی۔

کہانی کہ جواں رات کے ماتھے پر جھومر بن جائے۔۔۔۔۔

مگر کہانی کہے کون؟ وہ ایک دوسرے کے منہ دیکھنے لگے۔

"کہانی؟ مجھے تو نہیں آتی کہانی۔۔۔۔" ایک نے کہا۔

"مجھے بھی نہیں۔۔۔۔"

"میں نے تو کبھی کوئی کہانی نہیں سُنی۔۔۔۔۔"

"اور میں نے جو سُنی تھیں وہ بھول گیا۔۔۔۔"

"کہانیاں بچے کہتے ہیں۔۔۔" پانچواں بولا "اور میرے اندر کا بچہ مر چکا ہے"۔

"یارو کہانی کہو۔۔۔۔۔ کوئی کہانی کہ کسی طور یہ پہاڑی رات ڈھلے۔۔۔۔۔۔ کوئی کہانی کہ کہانی سے نادیدہ منظر آنکھوں میں کھلتے ہیں، نامعلوم سمتوں میں ان دیکھی وادیاں اور مرغزار خبر و صدا دیتے ہیں، صورتیں جان پڑتی ہیں، خوش بُو کے بدن

اور آواز کے سائے لمس میں آتے ہیں۔ وہ بے نام لرزشیں اور گونگے تجربات کہ جن کا نام ہے نہ کوئی شکل، ہیئت پاتے ہیں، احساس کی تہوں میں لطافت کی پرتیں بے نقاب ہوتی ہیں، مبہم نقشے، ادھورے رشتے، موہوم گوشے اُجاگر ہوتے ہیں۔ خیالوں میں بستیاں بستی ہیں اور حیرانگی نمو پاتی ہے۔ یار وکہانی کہو۔۔۔۔"

اگلے نے مایوسی سے سر ہلایا۔ جیسے خوابوں کی خریداری کے لئے اس کی پھٹی جیب میں کوئی سکہ نہ بچا ہو۔" مگر میرے پاس تو کہنے کے لئے کوئی کہانی نہیں ہے"

"مجھے بہت سی کہانیاں آتی تھیں۔۔۔۔" ایک نے کہا "اور وہ تھیں بھی بے حد خوب صورت، کتابوں میں لکھے لفظوں کی طرح۔ لوگ رات رات بھر جاگ کر سُنا کرتے تھے۔ میں کہانیاں سُنایا کرتا تھا۔"

آگ بجھ چکی تھی اور وہ بدستور بیٹھے تھے۔ خوف اور سردی نے ان کی قوتِ ارادی سلب کر لی تھی۔ جلی ہوئی لکڑیوں میں سے رہ رہ کر دھواں اٹھتا اور سیاہ آسمان میں گم ہو جاتا۔ وہ حرکت بھی نہیں کر پا رہے تھے اور آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید کوئی دبی چنگاری سُلگ اُٹھے، حرارت کی کوئی رمق ہو جو باقی رہ گئی ہو۔ شہر سو رہا تھا اور پہاڑ اُن کی

Scanned with CamScanner

تاک میں تھے۔ جلتے شہر سے وہ بوڑھے کو اپنے کندھے پر بٹھا کر لے بھاگا تو اسے احساس تھا کہ وہ اپنے ماضی کا بوجھ اٹھائے لئے جا رہا ہے جسے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا ہے۔

"تو پھر سنائیے نہ کہانی ۔۔۔۔" انہوں نے اس سے درخواست کی۔

اس نے اُداسی سے سر ہلایا۔ "ساری کہانیوں کا انت ہو گیا، میرے پاس اب کوئی کہانی باقی نہیں رہی۔"

وہ اس کی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ "زور ڈالو ذہن پر، شاید کوئی بھولی بسری کہانی یاد رہ گئی ہو۔" انہوں نے اصرار کیا۔

سب پُر توقع نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

وہ آنکھیں بند کئے سوچ میں گُم تھا مگر دور دور تک کسی کہانی کا پتہ نہ تھا، سوچ کے منطقے آس لگائے تھے کہ کوئی کہانی نزول کرے کہ زرخیزی ہو اور شادابی آئے۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ رہی تھیں۔

"ایک تھا راجہ ۔۔۔۔۔" اس نے کہنا شروع کیا، پھر آپ ہی رُک گیا۔ "راجاؤں کا زمانہ تو لد گیا، اب تو پرجا کی کہانی ہونا چاہیئے ۔۔۔۔۔ اور پرجا کی کہانی مجھے آتی نہیں۔" اس کے بالوں کی فصل پسینے میں ڈوبی کھڑی تھی۔

ذرا دیر میں وہ پھر اٹھا۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔۔۔۔۔۔

Scanned with CamScanner

آنکھوں دیکھی کہتا نہیں کانوں سُنی کہتا ہوں۔ اپنے دیس کی بات نہیں دور دیس کا قصہ ہے ------ اور راوی نے یوں بیان کیا ہے ------" پھر وہ شک میں پڑ گیا۔ "راوی کو کیسے معلوم ہوا؟ پتہ نہیں اس نے ٹھیک سے سُنا اور درست دُہرایا بھی کہ نہیں؟" وہ واپس بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں کپاس پھولنے لگی۔

اس نے پھر ہُنکارا بھرا۔ "میری ماں سُنایا کرتی تھی---- ماں؟ ----- اس کی مامتا تو اپنے تحفظ کی ضمانت تھی۔ اس کا طبقہ میرا استحصال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی باتوں میں نہ کوئی تضاد تھا نہ اندرونی کشمکش ----- میں کسی رشتے کو نہیں مانتا۔ میں اس کی کہانی نہیں سناؤں گا۔" اس کے بالوں پر پہاڑوں کی برف پڑنے لگی۔

"لو سُنو، یوں ہوا کہ فلاں موقعے پر فلانی ----- مگر کیا فلاں موقع اور کیا فلانی، فلاں اور ڈھکاں ہی کیوں، زید اور بکر کیوں نہیں اور جب یہ اس طرح ادل بدل ہو سکتے ہیں تو ان میں حقیقت نہیں ہے۔ اور جب یہ واقعی نہیں ہیں تو اس کا کیا حاصل؟" اس نے دَم سادھ لیا۔ اس کے بالوں میں کپاس پھولنے لگی اور چہرے پر جھُرّیاں ------ اب وہ بوڑھا تھا، مگر بوڑھا تو ------ کئی دن سے بوڑھے کی آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ مٹیالی رنگت کی یرقان زدہ آنکھیں فضا میں نہ جانے کیا تک

رہی تھیں، ان کے بے لبی کو کس کا انتظار تھا۔ کئی دن سے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حلق سے خرخراہٹ کے سوا الفاظ نہ بن پاتے۔ پھر اس کی زبان گول ہو کر کھلے مُنہ میں سے چمکنے لگی اور مشکیزے جیسے سینے میں سانس کی دھونکنی چلنے لگی۔ وہ بوڑھے کے پاس جُھکا اور پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے؟"

"خ ..... خ ..... ختم ....." سرطان میں مبتلا حلق سے بمشکل الفاظ نکل پائے۔

بوڑھے کی پُتلیاں بالکل ساکت تھیں اور پلک جھپکنا بند ہو چکی تھی۔ زمین کی طنابیں کھنچ رہی تھیں کہ پہاڑ اور نزدیک آجائیں۔ پہاڑوں کا گھیرا تنگ ہوا جاتا تھا اور سردی اُسی شدت سے بڑھتی جاتی تھی۔ انہوں نے صلاح کی کہ کوئی کہانی کہو کہ رات کٹے۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ وہ کہانی کہنا نہیں جانتے۔

آگ مرچلی تھی، سردی بڑھتی جاتی تھی، پہاڑ قریب آرہے تھے اور رات کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھی کیوں کہ جب لوگ کہانی کہنا بھول جائیں تو رات بہت لمبی ہو جاتی ہے۔

(مارچ ۱۹۸۱ء)

Scanned with CamScanner

شہر جو کھوئے گئے

کوئی جو مجھ سا ہو
اور مجھ پر بس ترس نہ کھائے
کہ میں بالآخر اس قوم سے ہوں
جس کی دانش وری
اس کے ساتھ مر جائے گی۔

لوئی زوکوفسکی

زمین کے اندر سے ایک شہر نکلا۔ اتفاقاً کوئی کدال جا ٹکرایا اور زمین کے سینے میں سے، ریت کی تہوں میں چھپی ہوئی دیواریں، برابر چنی ہوئی اینٹوں کی دیواریں، دیواروں کے مکان، مکانوں کی گلیاں، محلے، بازار، پورا شہر برآمد ہوا۔ مدفون گلی کوچے اور کھنڈرائی عمارتیں، جن پر گذرے زمانوں کی دھول بیٹھ گئی تھی، پردۂ خاک سے باہر آئے۔ ماہرین بہت عرصے تک اس پر تحقیق کرتے رہے مگر اس بارے میں نہ جان سکے کہ نہ تو اس کا طرز تعمیر جانا پہچانا تھا نہ وہاں کے آثار دوسرے کھنڈروں جیسے تھے۔ لمبی چوڑی محرابیں، گول دروازے، پتھروں پر کندہ نشانات،

عبارتیں ، سانپ اور عقاب کا جسم رکھنے والی شبیہیں ، مُہریں ، پرانے سکّے ، سکّوں پر بنی رعب دار شکلیں جن کے بُشرے پر شاہی تھی انداز میں جلال ، مٹّی کے کھلونے ، زیور ، آہنی ہتھیار ، اوزار ، ٹوٹے برتن ـــــــ کوئی نہ جان سکا کہ یہ کس قوم کی نشانیاں ہیں ، وہ کون لوگ تھے جن کے یہ آثار باقی رہ گئے ، کس نسل اور کس تہذیب سے تعلق رکھتے تھے اور چلے کہاں گئے ۔ سب سے زیادہ حیران کُن چیز وہ پُراسرار اور پیچیدہ عبارات تھیں جو پڑھی نہیں جا سکی تھیں اور جو شہر کے وسط میں نصب شدہ سفید پتھر کے ایک لمبے مینار پر کندہ تھیں ۔ کیڑے مکوڑوں جیسے ٹیڑھے میڑھے نشان پتھر میں کُھدے ہوئے ۔ کیا کہہ رہے تھے یہ حرف ؟ پتہ نہیں ۔ آئندگان کے نام کون سے اہم پیغام تھے جو اس قوم نے اپنی یادگار کے طور پر پتھر میں محفوظ کرنے ضروری سمجھے ، کیا مقصد تھا ان میں ؟ گذرے ہوؤں کی یاد ، بیتی چیزوں کے نشان ، حکومت و حرفت کے نکات ، بہت پرانی تہذیب کا سارا عمل ۔۔۔ کون تھے وہ لوگ اس شہر کو بسانے والے ؟ کیا سوچتے تھے ؟ شمع کی روشنی اور عشق کی گرمی سے واقف تھے ؟ فصلوں کی کٹائی پر جشن مناتے تھے اور چاندنی راتوں میں شعر پڑھا کرتے تھے ؟ کیسی تھی ان کی زندگی ؟ محققین سینکڑوں برس تک غور کرتے رہے ، کچھ حل نہ پا سکے ۔ مایوس ہو کر اس شہر کو تاریخ کے دوسرے لاینحل

معموں کے ساتھ داخلِ دفتر کر دیا گیا کہ تاریخ کے دامن میں ایسے شہروں کی کمی نہیں جو ایسے کھوئے گئے کہ کوئی نہ پا سکا۔ مگر ایک محقق دُھن کا پکّا برابر اس موضوع پر کام کرتا رہا۔ بہت ریاضت کے بعد آخر اسے ایک روز نہایت وجدانی طور پر خیال آیا کہ چوں کہ یہ علاقہ بلادِ ہند اور ملک پارس کے درمیان واقع ہے اس لئے ہو نہ ہو یہاں کی زبان میں ہر دو ممالک کی گفتگو کا امتزاج رہا ہو گا۔ اس طور جو اس نے سوچا تو عقدہ یوں کھلا کہ پتھر پر کندہ یہ عبارت، جس کے حروف سیلِ وقت سے تاراج ہو کر جا بجا اُکھڑ گئے تھے، یوں تھی:۔

"اے راہی رہرو ٹک نظرِ عبرت سے ادھر دیکھ لے-----
اے عزیز ہماری اصل اطراف وجوانبِ-----کی ہے، بعد مُدّت اس سرزمین میں وارد ہوئے، یہاں خیمہ گاڑ کے قیام کیا، قومِ ہنود کو رام کیا، تعمیر اس بلادِ مینو سواد کی------"

اس کے بعد مینار اتنا شکستہ تھا کہ عبارت پڑھی نہ جا سکتی تھی۔ کوئی اور نشانی بھی ایسی نہ تھی کہ جس سے شہر تعمیر کرنے والی اس قوم کا حال معلوم ہو۔ بہت تلاش کے بعد مینار کے اندرونی حصے میں دیوار پر کھنچی ہوئی لکیروں سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکا کہ یہاں کسی نے لکھا ہے-----"غدّاری کا ایک لمحہ اور وہ ہمارے ملک پر چھا گئے، اسے دبا لیا، ہمارے ہم وطنوں کو

ظلم کی آخری غیر انسانی حد پر کھینچ لے گئے ، مدت سے ہماری عورتیں ایسے بچے جن رہی ہیں جن کا ناک نقشہ ہمارے لئے اجنبی ہے ، انہوں نے ہماری عمارتوں کو ڈھا دیا اور ہمارے ارادوں کو پست کر دیا ، ہماری تہذیب غارت ہو گئی ، انہوں نے ہماری نشانیاں مٹا دیں ، ہماری زبان پر پابندی لگا دی ، ہمارا علم ، ہماری صنعت ، ہُنر ، ہماری نشانیاں ، ہماری تہذیب ، ہماری زبان ۔۔۔۔۔"

اس کے بعد عبارت میں کسی اجنبی زبان کے حُروف کی اتنی زیادہ آمیزش تھی کہ پڑھا نہ جا سکا۔

(۱۹۷۹ء)

ساتواں دن

شمع میرے سامنے آتی ہے۔
لیکن محفل تو اُٹھنے والی ہے ——

اب شمع میرے سامنے آئی ہے تو محفل اُٹھنے والی ہے۔ ایسے میں مَیں اپنی کہانیاں کہتا ہوں۔ بھولی بسری، پرانی دُھرانی کہانیاں۔ دور دیس کی بات سناتا ہوں اور بیتے دنوں کی، رفتہ و گذشتہ کو دھیان میں لاتا ہوں، ان طور طریق کا ذکر جو متروک ہوئے اور اُن لوگوں کا دھیان جو کھوئے گئے ------

اگر وہ پہلے کا سا زمانہ ہوتا جب ہر انسان فرشتہ تھا یا شیطان اور سروشِ غیبی نے پردہ نہ کیا تھا تو میں بھی پرانے داستان گو کی طرح کہانی سُناتا کہ آنکھوں دیکھی کہتے نہیں کانوں سُنی کہتے ہیں، جھوٹ سچ کہنے والے کی گردن پر، کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، رعیت شاد مملکت آباد.....
میرا کام سہل رہتا، صاحبقراں مُلک پر مُلک فتح کئے جاتے، کافروں

کا منہ کالا اور نادیدہ خدا کے ماننے والوں کا بول بالا ہوتا رہتا، لشکرِ کفار کے سربرآوردہ پہلوان شکست کھا کر پیٹھ دکھا جاتے یا جو واقعی شجاع ہوتے وہ طوقِ اطاعت پہنتے اور نازک اندام شہزادیاں کہ دیکھے سے جن کا رنگ میلا ہو، لشکرِ صاحبقرانی کے طلعت پیکر نوجوانوں کی یاد میں اشعارِ آب دار بزبانِ فارسی پڑھے جاتیں، ایک ایک پھول کا مضمون سو رنگ سے باندھا جاتا، طلسم کا بیان ہے تو اوہو عیاری کا ذکر ہے تو آہا، وقت تھم جاتا اور زمانہ بھی شوق سے سننے لگتا..... مگر افسوس کہ وہ داستان گو داستان کہتے کہتے سو گئے، سننے والوں کو جھپکی آ گئی، پیالوں میں رکھی افیم سوکھ گئی، بوسیدہ اوراق کو دیمک چاٹ گئی۔ منشی نول کشور کا مطبع بند ہو چکا اور میر باقر علی داستان گو مر گئے۔ اب شمع ہمارے سامنے آتی ہے، میں دھیان کی سیڑھیوں پر پیر رکھتا ہوں تو میرے قدموں تلے لکڑی کا پرانا شکستہ زینہ ڈولتا ہے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں، چراغ پھیکے پڑ چکے، محفل کی رونق گئی۔ میں صبحدم بالائے بام آیا ہوں۔

میرا نام پکارا جاتا ہے۔ اب میری باری ہے۔ میں آگے آتا ہوں، اگلی پچھلی صفوں میں ہلچل سی ہوتی ہے، شور تھم جاتا ہے، لوگ میری طرف دیکھنے لگتے ہیں، ہر شے دم سادھ لیتی ہے اور میں اپنی کہانیوں کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہوں جیسے نوآموز اداکار

اپنے پہلے ڈرامے پر۔ وہ جو نظمیں پاسٹر ناک نے "ڈاکٹر ژواگو" کے آخر میں لکھی ہیں، ان میں سے وہ والی جس کا نام "ہیملٹ" ہے، میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے:۔

"شور تھمنے لگتا ہے۔ میں اسٹیج پر آتا ہوں۔
دروازے سے ٹیک لگائے
میں سنتا ہوں دور سے آتی ہوئی بازگشت میں
کہ کیا کچھ ہو گا میری صدی میں۔"

"زندگی اتنی آسان نہیں جتنا کھیتوں سے گذرنا"، اور کہانیاں کہنا بھی اتنا آسان نہیں جیسے دھوپ میں کھیلتے بچے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ دور کی آواز سے کوئی ایسا، کوئی اشارت حاصل کروں کہ میرے دِنوں میں کیا واقعات پیش آئیں گے، کیسی گذرے گی۔

کسی صوفی نے بددعا دی تھی کہ خدا تم کو دل چسپ دَور میں پیدا کرے۔ بددعا تو نہ جانے کسے دی تھی، لگ مجھے گئی۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں بہت دل چسپ دور میں پیدا ہوا ہوں۔ کسی بھی سنجیدہ ادیب کی طرح میں ان ازلی و ابدی سوالات کو چھاننا پھٹکنا، ان کی جستجو کرنا چاہتا ہوں جو ابتدائے آفرینش سے انسانی ذہن کو پریشان کر رہے ہیں اور مجھے اس عہد سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو اتنا دل چسپ ہے کہ تاریخ کا شاید ہی کوئی اور دور اس

مسحور کُن حد تک دل چسپ رہا ہو کہ اس دور میں ساری زندگی، ساری کائنات اسکرین پر تصویر کی طرح نظر آتی ہوئی لگتی ہے، اور اس سیر بین کا منظر جلدی سے بدل جاتا ہے؛ اتنا دل چسپ دور کہ اس کی شتابی کسی مستحکم فکری منہاج اور ORDER کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ دونوں بھاری پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں اور اس تصادم سے جو چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں وہ اندھیری بستی میں جگنوؤں کی طرح اُڑتی ہیں۔ میں ان جگنوؤں کو پہچانتا ہوں اور اپنی ٹوپی میں جمع کرتا ہوں کہ یہ میری کہانیاں ہیں۔

کہانیوں کے ضمن میں یہ جگنوؤں کا ذکر جذباتی خود اعتمادی اور نرگسیت آمیز خود تسکینی کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے ان کہانیوں کی نوعیت اور ان کی ماہیت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کہانیوں کو لکھ لینے کے بعد دوبارہ پڑھتا ہوں تو یہ کہانیاں کسی حکیم کا باندھا طلسم لگتی ہیں، مَیں ان میں گُم ہو جاتا ہوں مگر ان کہانیوں کی دُنیا میری بنائی ہوئی ہے، جس کے لئے میں نے لفظ کُن کہا، اس عالم کو روشنی دی اور سمندر، اور پھر اسے اپنے خواب و خیال سے آباد کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ افسانوی دنیا تکمیلِ تخلیق کے ساتویں دن کیسی لگتی ہے، اور چوں کہ ساتواں دن سبت ہوتا ہے اس لئے

Scanned with CamScanner

آج کام نہیں بلکہ باتیں۔

میری کہانیوں کی ابتدار نوعمری کے خوابوں میں ہوئی۔ اُس بیمار بچّے کے خواب جس کے ہنستے کھیلتے تخیّل نے اپنی اداسی کے واسطے آوازوں اور سایوں میں ساتھی ڈھونڈ لیئے تھے۔ پھر یہ میرے لئے خُفیہ زندگی بن گئی۔ دن رات کے اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے آنے جانے سے اندرون کی طرف چُھپی ہوئی، زیرِ زمین چشمے کی طرح، جو آس پاس کو سیراب کر دیتا ہے، ہری گھاس اور جنگلی پھولوں کو اندر ہی اندر نمو پہنچا کر زمین کو ڈھک دیتا ہے، اور جس طرح زمین کے اندر اس کا ترنّم سنائی دیتا ہے مجھے اپنے اندر اس کی گنگناہٹ سنائی دی۔ ابتدار میں یہ بچّے کا کھیل تھا جو اپنے خوابوں میں خود کو خالق و مالک دیکھتا ہے، لیکن یہ خواب میرے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، میرے اندر جوان ہوتا رہا، میرے اندر مجھ سے زیادہ سنجیدہ، توانا، پُر قوّت، اور جوں جوں یہ خواب پروان چڑھتا جاتا، مجھ سے وہ تمام دانائی اور سوچ اور آگ اور ہُنرمندی طلب کرتا رہا جو میں بہم پہنچا سکتا تھا۔ بچپن کی حیرت بلوغت کے شعور میں ڈھلنے لگی تو یہ خواب ہیئت پا گیا۔ امرتا پریتم کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ خُدا نے جس قوّت سے دُنیا تخلیق کی تھی اس قوّت کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہر انسان کے حصّے میں آتا ہے۔ یہ قوّت میرے پاس بھی آئی، مُٹھی بھر ہی سہی، اسے میں نے محسوس کیا۔

Scanned with CamScanner

اسی سے کام لیتے ہوئے اپنے زندہ وجود، گوشت پوست کے جسم وجاں سے قطرہ قطرہ ذرّہ ذرّہ اپنی تخیلاتی تخلیق کی دنیا میں منتقل کرنے لگا حتیٰ کہ یہ خواب مثل دنیا کے ہُوا اور بطونِ خواب کا یہ عالم کاغذ پر اترا۔ یہ خواب مجھ سے جاری ہوا اور اب مجھ سے آزاد ہوتا ہے۔

ان کہانیوں کو لکھ کر میں اپنے خوابوں کو یوں آزاد کرتا ہوں جیسے کوئی پنجرے سے کبوتر اُڑا دے۔ مگر ان پرندوں کو آزاد کرنے سے پہلے انہیں پروان چڑھانا پڑتا ہے۔ اور یہ وہ لال سبز کبوتر ہیں جو صرف سچے موتی چگتے ہیں۔ خوابوں کے یہ ہم زاد پرندے میرے سینے میں پھڑپھڑاتے ہیں، میرے ذہن میں نیلے آسمان کی مثل پرواز کرتے ہیں۔ آگ چُرانے کی پاداش میں پرومیتھیئس کو دیوتا زیوس نے چٹان سے بندھوا دیا تھا اور تیز چونچ والے ایک عقاب کو مامور کیا تھا کہ اس کا کلیجہ نوچتا رہے۔ یہ پرندہ پرومیتھیئس کا عذاب تھا، میں نے اپنے ہم زاد پرندے کو، جو کہ مجھ پہ مامور ہے، کہانیاں سُنا کر سدھانا چاہا ہے۔ میں نے اسے تربیت دی ہے کہ خوابوں سے بیرون کی طرف سفر کرے۔ میری کوشش ہے کہ لاشعور کے وسائل وذرائع کا زیادہ سے زیادہ استعمال، انہیں بڑی سے بڑی تعداد میں بروئے کار لانے کا عمل تحریر شدہ مواد پر کڑی سے کڑی گرفت، مواد پر شعوری قابو کے ساتھ امتزاج

پا جائے؛ یادوں، خوابوں، خیالوں کے نسلی ورثے اور مدفون خزانے کو زیرِ زمین پوشیدہ معدنیات اور ذرائع توانائی کی طرح نکالا جائے اور فنّی گرفت اور ذہنی قابو کی صنعت و حرفت سے گذار کر "پروسیس" کر لیا جائے۔ یہاں یہ تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں کہ لاشعور ہی میں زندگی کے منبع و مآخذ اپنی جھلک دکھاتے ہیں، اور وہ تمام ساحری، تمام شاعری، دیومالا، علامات، معتقدات، پرچھائیاں، خواب و خیال کے سلسلے، رفتہ و گذشتہ کے قافلے جو انسان میں ہوتے ہیں۔ اپنی دریافت کے وسیلے سے فن کار اُن کا سراغ پاتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے کوہ کنی کرتا ہے تو بے اندازہ توانائی نکلتی ہے۔ لیکن اس کے اوپر انتہائی فنّی نظم و ضبط رکھنا پڑتا ہے ورنہ یہ موج نہنگ بن جاتی ہے۔ یہ آسیبی قوتیں فن کار کے ذہن میں اُدھم مچاتی ہیں، اسے عجائبات دو عالم کی سیر کو لے جاتی ہیں؛ یہ آوازیں مجھے ایسے مقام پر لے آئیں جہاں زیرِ زمین پانی کی گنگنا ہٹ سنائی دیتی تھی۔ میں نے پاؤں مارا تو پانی نکلا، اور میں نے اس کے جزر و مد میں انفرادی و ملّی زمانوں کو ماضی و حال و استقبال کے روپ بدلتے دیکھا، زندگی کو پایا کہ آبگینہ ہے جس میں چھلکتی شراب کے اندر لبو قلمونی و نیرنگی اپنا جلوہ دِکھاتی ہیں، چاند تارے ٹنکی چُنری ہے کہ کبھی سمٹتی ہے، کبھی کھُلتی ہے۔ پتہ نہیں افسانے لکھنے والے تلمیذ الرحمٰن ہوتے

ہیں یا نہیں، اور افسانے کو بھی سروشِ غیبی کی تائید حاصل ہے یا نہیں، اور اگر افسانے کی "میوز" ہوتی بھی ہے تو جو آواز میں نے سُنی وہ اسی کی تھی۔ اپنے وجود کی گہرائیوں سے آتی ہوئی یہ آواز میوز کی نہیں، تو یہ وہ چیز ہے جسے ژونگ نے اجتماعی لاشعور کہا تھا۔ ان کہانیوں میں مَیں نے ابھی اسی آواز کو محفوظ کر لینا چاہا ہے جیسے ساحلی ریت پر پڑی ہوئی سیپی جو سمندر کی لہروں کا عمل جانتی ہے کہ اس پر کان لگا کر سُنو تو سمندر کی آواز آتی ہے۔

جو شروع میں بچپن کا کھیل تھا وہ جی کا روگ ہوا اور وہی آخر کو فن ٹھہرا۔ میں نے لکھنا سیکھا۔ ہمارے ادبی ماحول میں شاعری چوں کہ فن کی اعلیٰ ترین شکل سمجھی جاتی ہے، اس لئے کوئی بھی نوآموز جس میں ادبی جراثیم ہوتے ہیں وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ابتدا میں مَیں نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، بہت زور مارا، بہت کاغذ سیاہ کیا۔ میں ایسی شاعری کرنا چاہتا تھا جو بیک وقت بہت حسیاتی ہو اور اس کے ساتھ اپنے اندر فکری گہرائی کی گنجائش رکھتی ہو، شیشے کی طرح واضح، درخت کی طرح پُر قوت اور موت کی طرح با معنی، ایسی شاعری جس میں جامد اشیاء بھی اسی سادگی اور وقار سے آسکیں، جس میں زندگی کی تمام بیزار کُن یکسانیت اور خوف اور شان اور حیرت سما سکے، اور اسلوب جو اتنا شفاف ہو کہ "شاعری" ہوتی ہوئی نہ محسوس ہو اور پھر بھی شعری تجربہ

حاصل ہو جائے۔ مدّت بعد مجھے احساس ہوا کہ میں جیسی شاعری کرنا چاہ رہا تھا وہ بقول آندرے سنیاوسکی POETRY OF LIFE'S PROSE تھی۔ انہی دنوں ایک ادھوری نظم پھیل کر کہانی بن گئی۔ شروع میں مَیں نے بہت چست و چالاک کہانیاں لکھیں۔ شوخ چنچل کہانیاں جن میں زندگی کی SUPERFICIALITIES کی بالائی سطح پر سے یوں پھسلتا چلا گیا جیسے برف پر اسکیٹنگ کر رہا ہوں۔ مگر ایک کہانی ایسی ملی جس پر برف کی سطح پتلی تھی، میں اسی انداز سے پھسلتا چلا آیا تو برف کی تہہ ٹوٹ گئی اور میں برفیلے یخ میں اندر۔ یہ کہانی میری افسانوی تعمیر میں وسطِ محراب کا پتھر ثابت ہوئی۔ بس پھر کیا تھا میں اُس گل بکاولی سی کہانی کی کھوج میں نکل پڑا جس سے اندھے بادشاہ کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں، دلوں کا سکون لوٹ آئے۔ اور وہ جو بھٹکتے ہوئے شہزادوں کو راستہ دکھانے والے، لوحِ طلسم چمکانے والے بزرگ مِلا کرتے تھے تو مجھے اپنے ایک بزرگ کی موجودگی کا احساس ہونے لگا جو میرے افسانوی اسلوب میں یوں آ گئے جیسے دھوپ گھڑی پر کرن کا سایہ پھیلنے لگتا ہے ——— میں نے سر اُٹھا کر جو دیکھا تو اپنے دادا کو وہاں موجود پایا۔ میں نے کہانیاں کہنا ان سے سیکھا۔ ہمارے خطۂ زمین میں خاندان ایک سماجی ادارے کی حیثیت سے یوں بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، اور ہمارے خاندان میں "خاندان" بھی

بہت پُر قوّت ہے۔ انسلاکات، تعلقات، مماثلتوں اور نسبتوں کا ایک سلسلہ ہے کہ کبھی یوں لگتا ہے زندگی کی کوئی متحرک رَو ہے جو نسل در نسل چلتی ہوئی ان سے میرے والد تک اور پھر اُن سے مجھ تک آتی ہے گویا میں اُن کی توسیع ہوں اور وہ میرا پرانا ایڈیشن جس میں تفصیلات الگ ہیں مگر نفسِ مضمون ایک۔ مگر اس سے بھی زیادہ، ان کی ذات میں مَیں نے پوری ایک تہذیب کی جھلک دیکھی ——— وہ خودداری، وہ وضعداری، رکھ رکھاؤ، قناعت، بُردباری، تمکنت، وقار، نفیس مزاجی، خوش ذوقی، بزرگانہ شفقت، بے لوث محبّت، خلوص، بزم کی رونق، محفل آرار، جہاں بیٹھے ہیں تو اپنی جگہ مَن بھر کے، اُٹھیں تو لاکھوں کے، چُپ رہیں تو وقت کے ازلی و ابدی سناٹے کی طرح اور بولیں تو جیسے ہزار داستان چہک رہی ہے۔ دادا ابّا نے بہت بھرپور، متنوّع اور مکمل زندگی گذاری، اتنی نستعلیق زندگی کہ آج اس کا تصوّر بھی مشکل ہے۔ اور اس کے دوران ان کی یادوں کے حیرت انگیز خزانے میں دلچسپ قصّوں، واقعات، چٹکلوں، نقلیات اور لطائف کی پوری الف لیلیٰ جمع ہوگئی تھی جو ایک آن میرے سامنے سم سم کی طرح کھُل گئی۔ اپنی زندگی کی اس بوقلمونی اور نیرنگی کو انہوں نے میرے ذاتی شعور میں اس طرح منتقل کیا گویا وہ سب میرے ہی تجربے کا حصّہ ہو۔ پھر بات یہ ہوئی کہ اس

Scanned with CamScanner

آن ڈھلتی عمر والے لوگ میرے لئے ایک واردات بن گئے اور بقول انتظار حسین، ان کی ڈھلتی عمریں اس ڈھلتی تہذیب کی علامت بنی ہوئی تھیں جس نے مجھے جذبہ بن کر آ لیا تھا۔ میرے اس جذبے اور واردات کا نامیاتی ارتقار دادا ابا کے زیر سایہ ہوا۔ اس سلسلے کی تین کہانیوں میں وہ بذات خود موجود ہیں، لیکن میری زندگی کی طرح میری کتاب کا بھی ان سے ہر واسطہ براہ راست ہے، گہرا اور اتنا شدید کہ میرے لئے اس کا غیر جذباتی معروضی بیان بہت مشکل ہے۔ اس کتاب کے کئی افسانے انہوں نے سُنے، بعض پسند بھی کئے۔ یہ سارا سلسلہ میرے ذہن میں کھن کھجورے کی طرح پنجے گاڑے ہوئے تھا اور میرے تخیل کے اندر بھنور میں پھنسی ناؤ کی طرح گھومتا جاتا تھا جو ہر چکر پر تھوڑا اور ٹوٹتی ہے، تھوڑا اور ڈوبتی ہے کہ فروری ۱۹۸۱ء میں دادا ابا چلے گئے۔ محبتوں کے باغ میں ایک قبر بن گئی اور اس قبر پہ چڑھانے کے لئے میں یہ گلاب اُگا لایا۔ اس صدمے نے جہاں مجھے کئی ماہ تک ماؤف کر رکھا وہیں اس کتاب کو بھی اُگلوا لیا کہ اب یہ ان کی یادگار ہو گئی تھی۔

میں نے اتنی کہانیاں سُنی ہیں کہ اپنا آپ بھی کہانی لگتا ہے جب میں چھوٹا تھا اور کہانی سُننے کے لئے ضد کرتا تھا تو مجھے سمجھایا جاتا تھا کہ وقت بے وقت کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھلا وہ کون سے مسافر ہوں گے

Scanned with CamScanner

جو چلتے چلتے ایکا ایکی راستہ بھول جائیں گے صرف اس لئے کہ دور کہیں کوئی بوڑھی عورت ایک بچے کو کہانیاں سُنا رہی ہے۔ کہانیوں سے منزلوں کے کھوٹے ہونے کا تو مجھے پتہ نہ تھا، مجھے تو کہانیوں کا چسکا تھا، اور رو دھو کر کہانی سُن لیا کرتا تھا۔ اب مسافر کہانیاں کہنے سے راستہ نہیں بھولتے کہ ان کے ساتھ سفر کے نقشے اور ٹریول گائیڈ ہوتے ہیں، سفر کے وہ انداز بھی بدلے گئے اور وہ راستہ بھلا دینے والی کہانیاں بھی بچھڑ گئیں۔ پتہ نہیں ان کہانیوں نے کتنے مسافروں کی راہ کھوٹی کی، ان میں سے ایک مسافر کو میں جانتا ہوں جو کہانیاں سُننے سے راستہ بھول گیا۔ وہ میں ہوں۔

جہاں جاتا ہوں کہانیاں میرے ساتھ چلتی ہیں، اپنی ضیاء بھیجتی ہیں، راستہ دِکھاتی ہیں، منزلوں کا پتہ دیتی ہیں، قطب تارے کی طرح۔ کہانی کالی بلّی کی طرح راستہ کاٹ جاتی ہے، میں سب بھول بھال کر کہ مجھے کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے اس کے سراغ میں چل پڑتا ہوں۔ کہانی چھب دِکھلا کر غائب ہوئی اور میں بے تاب ہو کر اسے کھوجتا ہوں اور پکارتا ہوں کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ پھر انہی کہانیوں کے روائتی شہزادے کی طرح خُرجی میں اشرفیاں اور کھجور لے کر اس اَن دیکھی شہزادی انجمن آرا کو پانے کے لئے نکل پڑتا ہوں جس کی خبر ہزار

داستان پرندے اور ہیرا مَن طوطے لاتے ہیں، جس کی ایک جھلک دیکھ کر شہزادے اونٹنی کھٹوانٹی لے کر پلنگوں پر پڑ رہتے ہیں۔ لیکن میری کہانیاں، پریوں کی شہزادیاں نہیں ہیں، میری کہانیاں بوڑھی عورتیں ہیں، اتنی بوڑھی جتنی مجھے کہانی سنانے والیاں تھیں۔ مجھے اب بھی وہ کہانیاں یاد آتی ہیں جن کے آگے سُننے والا بچّہ بن جاتا ہے، ایسی کہانیاں جو ہر انسان کے اندر سوئے ہوئے بچّے کو جگا دیتی ہیں، جو معصومیّت اور حیرت کی اسی کیفیت کو واپس بلا لیتی ہیں جن سے بچپن عبارت ہے، دنیا اتنی ہی حیرت انگیز اور دل چسپ بن جاتی ہے، کہانی سننے والا بچّوں کی طرح مسرّت انگیز استعجاب کے عالم میں کہانی سُنے جاتا ہے۔ کہانی سُننا آدمی کی سرشت میں داخل ہے، ہم تمام عمر کہانیاں سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، دیکھتے ہیں، کبھی کبھی خود بھی کہانی بن جاتے ہیں، لیکن جو کہانیاں ہم نے بچپن میں گھر میں بڑی بوڑھیوں سے سُنی ہوتی ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ ہمیں ان بڑی بوڑھیوں سے اور ان کی کہانیوں سے محبّت ہوتی ہے، ایسی محبّت جو اپنے کمالاتِ فن سے مرعوب و متاثر کرنے والے افسانہ نگاروں سے نہیں ہو پاتی، اور انہی سے ہم وقت بے وقت کہانیوں کی فرمائش کر سکتے ہیں کہ آج تو ہرن بادشاہ زادی کی کہانی سنیں گے اور آج بی پٹکی والی۔ مجھے ایسی کہانیاں پسند ہیں جو پڑھنے والے کو اس بچّے کی طرح

Scanned with CamScanner

مطمئن کرتی ہیں۔ بڑی بوڑھیوں سے سُنی ہوئی کہانیوں سے لے کر بازیافتِ ماضی کی داستانوں اور مکاشفۂ مستقبل کے وژن تک مجھے اپنی کہانیوں کی تلاش رہی ہے اور اس سفر میں جن کہانیوں سے میرا سابقہ پڑا ہے ان میں بیڈی لڑکیوں جیسی CHIC کہانیاں بھی ہیں (بلکہ بقول شخصے اسٹوریاں) اور بوڑھی عورتوں جیسی کہانیاں: داستانیں، حکایتیں، دیومالا، اساطیر، پری کتھائیں، لوک روائتیں، قصّے اور فیبلز۔ اور اصلی کہانیوں کا یہ سلسلہ ہی میری کہانیوں کا منطقہ ہے۔

ایک ناول تھا جو منفی انسپریشن کے ایک ہی لمحے میں کچّے کرسٹل کی طرح ٹوٹ گیا۔ اس کے ملبے میں سے جو ثابت ٹکڑے نکالے جاسکے ان کو جلانے، تپانے، بھٹّی میں پکانے، اور بہت تراش خراش جوڑ توڑ کے بعد بعض افسانے بنے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اس کتاب کے افسانوں میں وحدتِ تاثر اور لہجے کی یکسانیت ملے گی۔

اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دیگر افسانوی مجموعوں کی طرح ان تمام متفرق کہانیوں کا مجموعہ نہیں ہے جو مصنف نے ایک خاص مدّت میں لکھ ڈالیں ——— اس کتاب میں مجتمع کہانیوں سے ماسوا مُصنّف کی اور کہانیاں بھی ہیں جن سے کسی دوسرے سلسلے کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے ——— اور نہ یہ کہانیاں کسی مخصوص زمانی وقفے کی کارکردگی پر مشتمل ہیں، توام

بہن بھائیوں کی طرح ۔ بلکہ یہاں یہ کہانیاں اپنی موضوعی وحدت کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں۔ یہاں یہ ایک بڑے کُل کی جزو ہیں، اپنی جگہ قائم بالذات بھی اور باہم دیگر مل کر ایک برتر وجود کی تعمیر کنندہ بھی۔ یہ تمام کی تمام مل کر ایک ہیئم، ایک موضوع سے منسلک ہوتی ہیں، ایسی ہیئم جسے کہیں بھی تفصیلاً یا براہِ راست بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہ تمام کہانیاں اس پر یوں محیط ہیں کہ اس موضوعی دائرے کو مرکز کی طرف سے روشن نہیں کیا جاتا بلکہ یہ کہانیاں اس کے گرد حلقہ کھینچ کر اس کے رقبہ کو واضح کر دیتی ہیں اور اس کی صورت بنتی نظر آتی ہے۔ میں نے اس عظیم موضوع کی رزمیہ نہیں لکھی، اس جنگ کی چھوٹی چھوٹی چپقلشیں رپورٹ کی ہیں، اور وہ بھی اس طرح کہ اطراف وجوانب کو روشن کر کے اس گم شدہ مرکز کو اندھیرے کے ریلیف میں چھوڑ دیا ہے۔ کہانیوں کا مجموعہ دائرے کا گھیرا ہے اور ہر کہانی قوس۔

اس کتاب کے بیشتر مواد کو تھوڑی بہت چابک دستی کام میں لاتے ہوئے ایک اور ناول میں ڈھالا جا سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا کرنے سے احتراز کیا اور اس کی صورتِ موجودہ کو پسند کیا۔ جدید زندگی کا انتشار (جس کا مرکز گریز رجحان اس کتاب کے دل میں ہے) زیادہ فن کارانہ شستگی سے مانع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا لخت لخت تنظیمی ڈھانچہ، اس کی ہیئت بھی اپنے موضوع سے مطابقت

رکھتی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ آیا اس ڈھیلے ڈھالے، چیدہ چیدہ واقعاتی طریق سے کتاب کی اور اس میں پیش کردہ موضوع کی تعمیری وحدت از خود مجروح نہیں ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں کتاب کی جو ساختی وحدت ہے وہ ناول کے لحاظ سے کم ہے اور افسانے کے حساب سے زیادہ۔ اس کے باوجود کتاب میں 'COHESION' ہے اس کے اجزاء میں کششِ باہمی اور اتصال موجود ہے۔ یہ صفحات یوں ہم رشتہ و پیوستہ ہیں جیسے کُل اور جزو، جیسے فرد اور ملّت۔ کبھی سوچتا ہوں کہ ان نثر پاروں کو کانتو کیوں نہ کہا۔ اور کانتو پر مجھے اپنا مربی عذرا پاؤنڈ یاد آجاتا ہے جس نے دانتے کی طرح اپنی طویل نظم کے اجزاء کو کانتو کہا تھا، اور اس نظم میں پاؤنڈ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مرکزی بنیادی موضوع، پلاٹ، فکر کے تدریجی ارتقاء سے سُبک دوشی حاصل کر چکا ہے، اور اپنے کانتوز میں پلاٹ کی جگہ بڑے پیمانے کے INTERLOCKING RHYTHM OF RECURRENCE کو دی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جمالیاتی تصوّرات میں برپا انتشار سے وقوع پذیر ہونے والی ایلوڑویک امیجز کی دریافت فن کاروں کے لئے اسی اہمیت کی حامل ہے جو طبیعیات میں نیوکلر فشن کی دریافت۔ وکٹورین ناولوں والا پلاٹ کا تصوّر از کار رفتہ ہوا۔ اسے طاق نسیاں پر دھر بیٹھئے اور آگے بڑھیئے۔ یہاں پلاٹ اس الجھن کی طرح نہیں ہے جو سلجھتی جاتی ہے بلکہ اس

ریشمی لچھی کی طرح ہے جو لپٹتی جا رہی ہے۔ ایڈگر ایلن پو نے تو خیر طویل نظم کے وجود ہی سے انکار کیا تھا فی زمانہ جورج لوئی بورخے بھی ناول کے بجائے مختصر ہیئت کے ارتکاز کو پسند کرتا ہے اور یہاں بھی پورے ناول کی طوالت سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔ میرا موضوع ایک طویل و بسیط کتاب کا متقاضی ضرور ہے، ایک میجر کتاب، کتابِ کبیر۔ لیکن میرا قلم لیرک شاعر کا ہے ایپک شاعر کا نہیں۔ ہالی وڈ میں بننے والی فلموں جیسی "ایپک عظمت اور بڑائی" سے میں مرعوب نہیں ہوتا۔ میرے ذہن میں میجر کتاب کا جو تصور اس ضمن میں اُبھرتا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ افسانوی سلسلہ ہو جس میں ایک مخصوص وحدت ہو اور یہ سلسلہ یوں مرتب کیا جائے کہ INTERLOCKING اجزاء کا کُل بن جائے جس کے وسیع دائرہ کار میں ایک غنائی تصور کارفرما ہو، ادراک و فہم کا ایک زاویہ ہو، نامیاتی وحدت ہو۔ مجھے ایسی کتاب کی تلاش ہے، اور ایسی کتاب، بقول اوسپ مینڈل سٹام حقیقی کتاب بھی زندگی کی طرح دورانِ وقت میں لپٹے سے کھُلتی ہے۔

چنانچہ اس کتاب کا بھی پیٹرن یہی ہے۔ اس کتاب کے موضوع میں منظم زندگی کے خاتمے کا ذکر موجود ہے، لیکن اس میں خود ایک تنظیمی ڈھانچہ اور ساخت موجود ہے جو ترتیب کی ایک صورت، حقیقت سے مشابہت کا شائبہ ضرور دیتی ہے۔ پھر اس گل دستے کو کئی ڈھنگ سے باندھا جا سکتا ہے۔ آپ اس کتاب

کو مرثیے کی طرح پڑھنا چاہیں تو اس کو یوں مرتب کر سکتے ہیں کہ پہلے دو افسانے تمہید، اس کے بعد سراپا، تیسرے جزو کے چار افسانے رجز اور آخری چار ماتم؛ یا اگر اس کو نسخۂ تشخیص سمجھیں تو چار سلسلے یوں بنیں گے کہ ہر جزو ایک پروسس کے مطابق ہے، پہلے انسپیکشن، پھر PALPATION پھر PERCUSSION اور پھر AUSCULATION پہلے دو افسانوں میں معائنہ ہے، اگلی آٹھ کہانیاں ٹٹولتی ہیں، اس کے بعد والی PERCUSS کرتی ہیں اور آخری کہانیاں استماع۔ تو اس طرح کی نسبت ہے ان کہانیوں میں، مگر اس کی تفصیل بیان نہیں کروں گا ورنہ میں خود ان کا کردار بن کر رہ جاؤں گا۔

ابھی تک ان کہانیوں کے ذہنی و جذباتی پس منظر کی بات ہوئی (تفصیلی پس منظر نہیں کہ اگر اس کا ذکر چھڑ گیا تو پہاڑی سلسلے کی طرح دور تک کھنچتا چلا جائے گا)، وہ فوری پس منظر جو ایک شخص کی ذہنی تربیت و نمو میں ظاہر ہوا اور اس بنیادی SPADE WORK کی بات جو ان کہانیوں کی تعمیر میں صرف ہوا، اینٹ پر اینٹ چننے اور خواب کو حرف میں منتقل کرنے کا عمل؛ ان کہانیوں کے پلاٹ، کردار، معنویت، افسانوی فضا، لغت، تعمیری ڈھانچے پر کچھ نہیں کہا۔ اور وہ اس لئے کہ اگر ان میں سے کسی عنصر پر مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہوتی تو کہانی کے اندر ہی کہتا، اس ممکنہ اضافے کے مطابق اس کہانی کی صورت ڈھالتا۔ ان پر جو کچھ کہنا تھا کہانیوں

میں ہی کہہ دیا۔ اب ان پر کچھ نہیں کہنا، لیکن کیا بات ختم ہوگئی؟ ان اجزاء کو جوڑنے، کُل پُرزے اکٹھے کرنے اور چُولیں بٹھانے سے کہانی نہیں بنتی۔ کہانی کچھ اور مانگتی ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ اگر ان کہانیوں سے کردار، پلاٹ، واقعاتی ڈھانچہ، تعمیراتی ڈھانچہ، افسانوی فضا ہر چیز پرت در پرت اُتار لئے جائیں تو کوئی چیز باقی بچے گی یا نہیں۔ میرے خیال میں ایک بہت اہم چیز باقی رہ جائے گی۔ کسی کتاب کے معنی محض اس میں نہیں ہوتے کہ کس نے کیا کہا اور کس نے کیا کیا بلکہ فکشن کی معنویت کا بڑا حصّہ تو ان رشتوں میں ہوتا ہے جو مصنف کو اشیاء کے درمیان نظر آتے ہیں، محسوس ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو کوئی پوشیدہ اندرونی معنی ہیں اور نہ وہ علامت جس کا ان دنوں ہمارے ادبار میں بہت شہرہ ہے، یہ تو وہ منفرد زاویۂ نگاہ ہے جس پر کھڑے ہو کر ادیب دنیا کو دیکھتا ہے، وہ ذرا سی جگہ پیر ٹکانے کے لئے جو ارشمیدس نے پوری دنیا کو سرے سے ہلا دینے کے لئے مانگی تھی۔ متن کے الفاظ کے پیچھے، کہانیوں میں پیش کردہ معاشرتی زندگی کی تہہ میں اور رئیلزم یا سمبولزم کی اصطلاحات کے پس پردہ موجود ـــــ یا جیسے اس کتاب میں ایک مخصوص زمانے میں ایک مخصوص علاقے کی مخصوص حقیقت دِکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے احساسِ زندگی کو گرفت میں لانے کی کوشش ـــــ یہ چیز ہی اس کو وضع کر رہی ہے، اس

کی حیثیت کا تعین کر رہی ہے۔ یہی اس کی تہہ میں موجود خصوصیتِ عمومی ہے، اس کی روح ہے، اس کی حرکی رَو ہے، یہی وہ چیز ہے جو کتاب کو زندگی دیتی ہے۔ اگر کتاب محض چند کاغذوں کا دستہ اور الفاظ کا جتھا نہیں ہے تو جو چیز اس کو "ورائے لفظ" بنا رہی ہے وہ ہے حقیقت بذاتِ خود: حقیقت بطور مظاہر، تصوّر یا یا فلسفیانہ مدارج سے آگے خود "حقیقت" کی حقیقت۔ ادراک زندگی کے دوران جو اشکال میری نظر میں اُبھر سکیں اور احساسِ زندگی کے دوران جو نقش میرے ذہن میں سما سکے، ان کو "فن" کی صورتِ اظہار دیتے ہوئے میں جن نتائج پر پہنچا، انہی سے میری کہانیوں کی ہیئت عبارت ہے۔ اور میرے لئے اس امر سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا کہ میری گڑھنت موجودہ رجحانات سے پَرے کی چیز ہے اور میری کہانی کا خمیر میرے خیال سے اُٹھا ہے۔ ورجینیا ولف نے لکھا ہے کہ زندگی ترتیب سے روشن کئے ہوئے فانوسوں کا سلسلہ نہیں ہے، ایک نورانی ہالہ ہے، نیم شفاف ملفوف ہے جو ابتدائے شعور سے لے کر انتہا تک ہمیں گھیرے رہتا ہے۔ روشنی کے اسی دھندلکے میں مَیں نے اپنی فکشنل ریئلٹی تلاش کی ہے۔ کہانی کبھی حاصل ہوتی ہے، کبھی حاصل کی جاتی ہے۔ کبھی سڑک پر پڑے ہوئے ہیرے کی طرح مل جاتی ہے کبھی کوندے کی طرح لپکتی ہے۔ میں نے اپنے گھر کی چھت پر لائٹننگ کنڈکٹر نہیں

Scanned with CamScanner

لگوایا، میں تو اس آسمانی بجلی کو پکڑنے کے لئے گرج چمک کے طوفان کے دوران اپنی پتنگ میں مانجھے کی جگہ لمبا تار لگا کر نکل پڑتا ہوں۔

جو برق کی پرستش کرتے ہیں وہ حاصل کا افسوس نہیں کرتے اور غالب کی طرح برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کر لیتے ہیں۔ یہ بجلی پتنگ سے ہوتی ہوئی میرے خونِ گرم کے خرمن میں آتی ہے تو میری کہانیاں جل اٹھتی ہیں۔ فکشن کے تمام روائتی لوازمات دھندلا کے آپس میں مُدغم ہو جاتے ہیں، کیا پلاٹ کیا کردار، کہ اب ایک نئی صورت ہے: وہ "نورانی ہالہ، نیم شفاف ملفوف" جس کے گرد حسیت پتنگے کی طرح اڑتی پھرتی ہے، یہاں بھٹکتی ہوئی، وہاں سے گذرتی ہوئی، اسے دیکھتی ہوئی، اُسے چُنتی ہوئی، یہ تصوّر، تخیّل، کیفیات، فکر، منہاج؛ ان سب کے امتزاج سے جو کیفیت ہے وہی زندگی کی علامت ہے۔

اس تمثیل کے بعد سوال کی ہیئت یہ نہیں رہتی کہ اس کتاب میں آئیڈیا کیا ہے اور آئیڈیالوجی کیا۔ اور یہاں زیرِ بحث یہ بھی نہیں کہ اشپنگلر کے تصوّر کے مطابق یہ ہماری تہذیب کا کون سا دور ہے، آیا ہم موسم بہار و موسم گرما سے گذر کر دورِ خزاں میں داخل ہو چکے ہیں اور پت جھڑ ہمیں آواز دے رہا ہے۔ بہادری، عقائد کی پختگی اور عینیت کا دور ختم ہو کر مذہبی جنون، مادیت،

افادیت پسندی اور عقلیت کا دور دورہ ہوتا ہے، ارسٹوکریسی کی جگہ بورژوازی خروج پاتی ہے، زمین کے بجائے پیسہ اشیا کی قیمت کا پیمانہ ہوا اور وہ انسانیت سوز کاسموپولیٹن شہر وجود میں آگئے جو اپنے تمدن کے المیے کی نشانی بن جاتے ہیں اور تہذیب کی جگہ اس کی کم تر صورت تمدن نے لی یا نہیں۔ بلکہ سوال کی ہیئت یہ ہے کہ تہذیب کی یہ MORPHOLOGY کرداروں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اشپنگلر کے یہاں تاریخ تقدیر کی طرح ایک عظیم الشان وسیع المرتبت غیر شخصی قوت کی طرح حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ مگر چوں کہ یہ کتاب فکشن ہے اور فکشن میں انسانی کرداروں کا، گوشت پوست کے جیتے جاگتے لوگوں کا معاملہ ہوتا ہے تو مجھے اپنا رویہ مارکس کے اس خیال کے قریب قائم کرنا پڑتا ہے کہ "تاریخ کچھ نہیں کرتی ہے، اس کے پاس نہ تو بے اندازہ دولت ہے نہ وہ جنگیں لڑتی ہے بلکہ یہ تو خود انسان ہی ہے، جیتا جاگتا زندہ انسان جو ہر کام کرتا ہے جو ملکیت رکھتا ہے، جو جنگ لڑتا ہے۔" مگر اس کے ساتھ یہ توضیح لازم ہے کہ ان کہانیوں کو تاریخ کی الم انگیز ضرورت نے نہیں لکھوایا نہ ہی ان کا مقصد کچھ ایسی فرض شناسی ہے جس کا عندیہ سانتایانا کے اس انتباہ کی طرح ہے کہ "جو ماضی کو یاد نہیں رکھ سکتے وہ اس کو دہرانے پر مجبور ہوں گے۔" ان کہانیوں کے خالصتاً ادبی موتیف میں اس عہد کی اُس قوت کی تلاش شامل

ہے جو بساط بچھاتی ہے، شطرنج کے مُہرے سے چلتی ہے، میرے کرداروں کی تعمیر کرتی ہے اور ان کی تقدیروں کو متعیّن۔ علوم جدیدہ کی روشنی ـــــ یا اندھیرے ـــــ سے ماورا اور سیاستِ موجودہ کے امیوز منٹ پارک سے دور جہاں مکی ماؤس اور ڈونلڈ ڈک کھڑے اپنی پونچھ پھڑکاتے ہیں، مجھے META-HISTORY کے عبقری، تخیلاتی، توہماتی اور اسطوری تصوّرات عزیز ہیں جہاں دیوارِ گریہ درمیان سے ہٹ جائے، پُرانے معبد و ہیکل کی تجدید ہو اور میرا قدیم بچپن دیوتا پان کو گلیوں میں رقص کرتا دیکھے۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں غزل اور اس کی تہذیب ایک زندہ قدر تھی؛ جہاں غزل کی عاشق تنی، درویشی، رندی، سرمستی، غم نصیبی اور عیش کوشی، زندگی کا ایک تصوّرِ الم، آگہی کی بے تابانہ خواہش اور اس سے آگے آشوب آگہی کے دُکھ ـــــ جب دنیا سے سابقہ پڑا تو معلوم ہوا یہ سکّے اب بازار میں نہیں چلتے۔ جس کو یہ سکّہ دیا اس نے تعجب اور شک سے دیکھا اور خود کو اصحاب کہف کی مماثلت میں پایا کہ نیند سے جاگے تو دنیا بدلی ہوئی تھی اور ان کے سکّوں سے روٹی نہیں ملتی تھی۔ میری پرورش آؤٹ آف ڈیٹ انداز فکر کے مطابق ہوئی جہاں کسی کو احساس نہ تھا کہ پیروں تلے زمین سوکھی جھیل کی طرح تڑخ رہی ہے اور آتش فشاں میں کھولتا لاوا دھواں دے رہا ہے۔ وہ لوگ

جنہیں میرے دل نے جانا، میری آنکھ نے پہچانا، جن سے میں نے محبت کی، جن کی زندگیوں اور طریقِ زندگی کو ہی اصلِ زندگی جانا کہ اس کے واسطے سے خود کو محسوس کیا تھا، میں نے دیکھا کہ بدلتی ہوئی زندگی اور گذرتا ہوا وقت ان کی سادہ زندگیوں کو اُلجھاتے ہوئے گذرے۔ میں تو یہ کہانی سُناتا ہوں۔ میری کہانی نہ تو ممنوعہ چوتھی کھونٹ کا سفر ہے نہ ناصر کاظمی کے اتّباع میں ساتواں در کھولنے کی خواہش، نہ تو میں آتشِ رفتہ کا سراغ لیتا ہوں نہ کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں کہ مجھے ان کی تلاش نہیں۔ وہ لوگ میرے لئے کھوئے ہی نہیں اور اس آگ سے میرا گھر روشن ہے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ کارواں کے پیچھے ایک آدمی چلتا تھا جس کے ذمّے یہ دیکھنا بھالنا تھا کہ قافلے والوں کی کوئی چیز گری رہ جائے یا قافلے سے کوئی بچھڑ جائے تو یہ اٹھاتا جائے۔ میں اُردو افسانے میں یہی کام رہا ہوں۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر کوڑیوں کے مول ہیرے بیچتا ہوں اور آتش فشاں پر گلاب اُگاتا ہوں۔

یہ گلاب وہ فصل ہیں جو میں نے آنسون جل سینچ سینچ بوئی۔ یہ میری پریم بیل ہے، اب یہ پھیل گئی اور آنند پھل ہوئی۔ اپنی بیل کے انگور اور اپنے باغ کے گلاب کے واسطے پکارتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے کہ لوگ میرے باغ میں پھول چُننے آئیں میں ایک لمحے کو ٹھٹھکتا ہوں اور تامل کرتا ہوں۔ آنسوؤں سے پریم بیل اُگانے والی

Scanned with CamScanner

میرا بائی جس کو گلہ تھا کہ "آئی میں بھگتی کاج جگ دیکھ موہی" وہ تو پھر بھی یہ کہتی تھی " دودھ کی متھنیاں بڑے پریم سے بلوئی / ماکھن جب کارڈھ لیئو چھاچھ پیئے کوئی / ۔" کاش میرے پاس یہ اعتماد ہوتا۔ جہاں میرا بائی کو سننے والوں پر یقین تھا وہاں یہ جذبہ آج مفقود ہے۔ میرا قاری میرا دشمن ہے۔ جو چیز میرے لئے گلاب ہے وہ کسی کے لئے محض لفظی بازی گری ہو گی کسی کے لئے کاغذی پھول۔ اردو افسانے میں کارکردگی کا معیار منٹو عصمت بیدی۔کرشن رہے ہیں، اردو افسانے کے چار اِکے ــــــ حکم اینٹ پان چڑیا ــــــ ان چار بڑوں کی برتری مسلم ، میں نے اپنی کہانی کو ان کے سانچے میں نہیں ڈھالا کہ میں ترُپ کا پتہ ہوں، جس کے رنگ پر چال آجائے تو کیا بیگی کیا بادشاہ۔ اور نہ ہی میں نے آج کل عام طور سے لکھے جانے والے تجریدی افسانوں کا انداز اختیار کیا ہے۔ ادب میں نقطۂ نظر کا مسئلہ میرے لئے دین کی سی حیثیت رکھتا ہے اور دین کے بارے میں قریشِ مکہ کو جواب دیا گیا تھا کہ تم کو تمہاری راہ مجھ کو میری۔ بُری ہے یا بھلی ، میری راہ تو یہی ہے۔ لیکن مقصد اپنی انفرادیت کا ادّعا نہیں ہے نہ کسی بحث و تمحیص میں اُلجھنا کہ میں نے جو گلاب اُگانے چاہے ہیں وہ یونانی دیومالا کے بیپرین گلاب ہیں، جن کے حسن میں کوئی کلام نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد اُردو افسانے کو موضوعات ہی نہیں فارم بھی ملا تھا، تیار شدہ ہیئت

اور تکنیک کہ ہر ایک کو اپنے تجربے کے لئے مضبوط ظرف مل گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں کچھ اس قسم کا احساس تھا کہ افسانہ ہر وہ شخص لکھ سکتا ہے جو خط لکھ سکتا ہے۔ خاصی مدت کے لئے افسانہ نگاروں کا ذہن تکنیکی تجربوں کی طرف سے ہٹ گیا کہ انہیں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، ہر ایک مطمئن تھا کہ زندگی کو پیش کرنے کا یہ طریقہ جو ہے اس کے نتائج تسلی بخش ہیں۔ اور اس کو پڑھنے والوں کی تائید بھی حاصل تھی کہ اس دور میں افسانہ ہمارے میجر ادبی فارم غزل کی سی مقبولیت پانے لگا۔ ان "چار بڑوں" کا ہر افسانہ ایک اہم واقعہ ہوتا تھا جس پر لوگ باقاعدہ بات کیا کرتے تھے، اس کو اہمیت دیتے تھے۔ اس وقت کا افسانہ نگار جب کہتا تھا کہ منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا تو پڑھنے والے اقرار میں سر ہلاتے تھے گویا وہ یہ جانتے ہوں یا اب جان گئے ہوں۔ اگر یہی بات آج کا افسانہ نگار کہے تو کوچوان کو تو خیر کیا پڑھنے والے اسے بھی بے وقوف سمجھنے لگیں گے۔ پڑھنے والوں سے اب افسانہ نگار کو اس بھروسے کی بھی توقع فضول ہے جو کہانی سننے والے بچوں کو ہوتا ہے یا رات کے وقت الاؤ کے گرد جمع اہل قبیلہ کو اپنے قصہ گو پر۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان متفقہ اقدار و عقائد کی غیر موجودگی افسانہ نگار کے لئے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دیتی ہے، وہ کس طور اس کیفیت کو ابھارے کہ قاری اس کی

Scanned with CamScanner

بیان کردہ بات کو حقیقت، یا حقیقی زندگی کی طرح تسلیم کرلے۔ اس مسئلے کا حل ہر افسانہ نگار نے اپنے طور پر تلاش تو کیا ہے لیکن اس سے فن میں ضعف بھی آیا ہے۔ آج کے اردو افسانے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک مغربی نقاد کے یہ جملے پڑھیئے :۔

"ہمارے معاصرین ہمیں اس لئے پریشان کر رہے ہیں کہ انہوں نے یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے مخلص ترین بھی ہمیں صرف یہ بتائے گا کہ خود اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ دنیا کی تعمیر نہیں کر سکتے کہ وہ دوسروں سے آزاد نہیں ہیں۔ وہ کہانیاں نہیں کہہ سکتے کہ انہیں یقین نہیں رہا کہ کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ وہ جنرلائز نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات پر اعتبار کرتے ہیں بہ نسبت اپنی دانش کے، کہ جس کا پیغام ان کے لئے مبہم ہے۔"

ان کے برعکس پرانوں کے پاس زندگی کے بارے میں ایک طے شدہ رویہ تو تھا کہ زندگی "ایسی" ہے مگر اس کے ذریعے سے انہوں نے یہ تو سمجھا کہ لوگوں کے ایک دوسرے سے، چیزوں سے، کائنات سے کیا رشتے ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی انہیں یقین بھی تھا، ایسا یقین جو ان کی اپنی ذاتوں سے آگے بھی جاتا تھا۔ اور اگر یہ یقین حاصل ہو کہ آپ کے تاثرات دوسروں کے لئے بھی اتنے ہی معنی خیز ہیں تو اس طرح، بقول ورجینیا ولف "شخصیت" کی گھٹن اور قید سے بھی رہائی مل جاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے جین آسٹن کے

یہاں سلیقے کا وہ احساس ملتا ہے کہ ہر چیز، ہر جذبہ، ہر احساس، ہر مکالمہ، ہر جملہ اپنی جگہ اپنے قرینے سے ہے، اس کی جگہ متعین ہے اور کوئی دوسرا اس کی جگہ لے نہیں سکتا؛ اسی وجہ سے اس کے یہاں پرفیکشن کا اتنا احساس ہوتا ہے کہ ہنری جیمز کا سا "فکشن شناس" ناقد بھی اسے پرفیکٹ آرٹسٹ لکھ گیا۔ جین آسٹن کا نام سُن کر آپ کہیں گے کہ وہ اس معاشرے میں رہتی اور لکھتی تھی جہاں رکھ رکھاؤ، اخلاق و عادات ترقی کر کے 'مینرز' کی منظم و مربوط شکل اختیار کر گئے تھے، لیکن یہ قاری سے مشترکہ عقائد کی ہم رشتگی والی پشت پناہی ہمارے یہاں بھی رہی۔

محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:۔

"طلسم ہوش ربا میں کسی میلے یا باغ یا دعوت کا بیان دیکھیے۔ چیزوں کی صرف و محض فہرست بنا کر لکھنے والا مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے پڑھنے والوں کی دل چسپی کا سامان کر دیا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ چیز کا نام لیتے ہی پڑھنے والے کے ذہن میں ایک مخصوص ردِ عمل پیدا ہو گا، اس لئے اسے صفات کے ذریعے قاری کے احساس کو ہلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"

"چیز کا نام لیتے ہی پڑھنے والے کے ذہن میں مخصوص ردِ عمل" کا یہ یقین جو طلسم ہوش ربا کے مصنف کو حاصل تھا وہ آج کے افسانہ نگار کو حاصل نہیں؛ اسے اپنی دنیا کا خالق بھی بننا پڑتا ہے

اور اس کا ٹورسٹ گائیڈ بھی۔ روائتی معاشرے میں ایک مرکز تھا جہاں اشیاء مجتمع ہو سکتی تھیں اور ان کو حوالے فراہم ہوتے تھے، جس کے حساب سے چیزوں کی وقعت اور اہمیت متعین تھی، ضابطۂ حیات مرتب تھا اور اشیاء کی معنویت مقرر تھی جس سے معاشرے کا ادیب اور قاری سبھی واقف بھی تھے اور اس سے اتفاق بھی کرتے تھے۔ مربوط و منسلک معاشرے کے فراہم کردہ نظام اقدار کی غیر موجودگی میں جدید افسانہ نگار کو اشیاء کو اپنے ذاتی، شخصی احساسِ وقعت و اہمیت کے مطابق رکھنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے آزادی کا مزہ اور وجودی نظام ہائے فکر بطور بونس حاصل ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں۔ ادیب کی انا پہ بے تحاشہ بوجھ بڑھ گیا ہے۔ آخر کو دنیا کی معنویت کا بوجھ سہارنا آسان تو نہیں۔ اور جب اپنی ذات، اپنی انا ہی اچھے بُرے کا معیار ہو تو یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے جدید اردو ادب کا بہت بڑا حصّہ مریضانہ انا پرستی کا شکار ہوا ہے اور جس کی وجہ سے بہت سے معاصرین کی تحریریں ان کی ہی قبروں پر کتبے بن کر نصب ہو گئی ہیں۔ جدید اردو افسانے کی طباعی، اُپج، جدّت سے انکار نہیں نہ اس امر کو جھٹلایا جا سکتا ہے کہ پچھلوں کے لادے ہوئے غیر ضروری بوجھ، سماجی حقیقت پسندی، پلاٹ کی جکڑ بندی اور اس قسم کے تام جھام سے نجات دلا کر بے فکر آزادی کا کھلا کھلا احساس پیدا کیا ہے،

Scanned with CamScanner

مگر اس کے باوجود اس میں ایک عمومی کوتاہی ملتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس میں کسی جزوِ لازم کا فقدان ہے۔ اس کی مثال اس دسترخوان کی ہے جو مُرغن کھانوں سے لدا ہو مگر جس میں وٹامنز کی کمی ہو۔ جدید اردو افسانہ گرجتا ہے برستا نہیں۔ اس کی چمکتی بھڑکتی تیزی تُندی اپنے اندر نا آسودگی لئے ہوئے ہے۔ اور یہ ٹھنڈی آگ کی سی ضیائے بے حرارت آپ کو سب سے زیادہ اِس کتاب میں ملے گی۔ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک برق رفتاری سے گریز، ایک لمسِ گریزاں کہ بمشکل چھُوتا ہوا گذرتا چلا جاتا ہے اور پوری طرح گرفت میں نہیں آتا جو قاری کے کسی جذبے کا کیتھارسس نہیں کرتا۔ اس میں وہ تمام کوتاہیاں، فُقدان، قلتیں ملیں گی جن کا گِلہ میں جدیدیت کے نام پر کر رہا ہوں، اور ان میں تہذیبی روایت کا وہ تسلسل بھی نہیں ہے جو کہانیوں کو مکمل کرتا ہے، ٹوٹے رشتوں کو جوڑتا ہے، ان کے باہمی تعلق کو متعین کرتا ہے۔ یہ پیراڈاکس اس کتاب کی صورتِ تعمیر ہے۔ یہ میری ضرورتِ المیہ ہے، کہ یہ کہانیاں اسی مربوط ضابطۂ حیات کی غیر موجودگی کے بارے میں ہیں۔ اسی امرِ واقعہ کو تو میں کرانیکل کر رہا ہوں۔

اب میں اپنی تقریر صفائی ختم کرتا ہوں اور اس سے پہلے کہ آپ اس پر استغاثہ دائر کریں میں گواہانِ صفائی کو بلاتا ہوں کہ میری گواہی دیں۔ مگر ایک بات پہلے بتا دوں کہ یہ تنقیدی اسٹیٹمنٹ

نہیں ہے وہ تو عسکری صاحب "جزیرے" کے اختتامیے میں دے گئے تھے اور اس غضب کا کہ ابھی تک اسی طرح برمحل ہے، میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ وہ جو یار لوگوں نے کرٹسزم + فکشن کو جمع کر کے ایک چیز "CRITICTION" بنائی ہے تو اپنی کہانیوں کی کہانی سنا دوں اور تنہائی کی اُس رَو کو سمجھوں جو چیخوف کے ماسکو سے جوئس کے ڈبلن اور شیروُڈ انڈرسن کے وِنزبرگ اوہائیو ہوتی ہوئی مجھ تک آتی ہے۔ اب میں اپنے اُداس کپتانوں کو طلب کرتا ہوں: بورسِ پاسٹرناک جس نے اپنی نظموں کی تعریف سن کر کہا تھا کہ "یہ سب ادنیٰ چیزیں ہیں، مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ایک بالکل نیا دور، نئی ذمہ داریوں اور انسانی دل و وقار کی نئی کوششوں اور فریضوں کا دور، ایک خاموش عہد جس کا نام کبھی نہ پکارا جائے گا نہ بلند آواز میں اعلان ہو گا، ایسا وقت عملِ پیدائش سے گذر چکا ہے اور دن بدن نمودار ہوتا جاتا ہے بغیر کسی کی واقفیت کے۔ ان مبہم نئے اور گمبھیر واقعات پر تفکر کے لئے لخت لخت، ذاتی نظمیں کہاں مناسب ہیں۔ صرف نثر اور فلسفہ ان سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں"، جیمز جوئس جس نے افسانے کو بشارت بنا دیا، جو اپنی روح کی بھٹی میں اپنی قوم کا فن کارانہ شعور خلق کرنا چاہتا تھا؛ آئزک بیبل جس نے کہا تھا کہ بڑے سے بڑا ہتھیار دل پہ اس طرح وار نہیں کر سکتا جیسے بالکل صحیح جگہ لگا ہوا فُل اسٹاپ، اور جس نے کہا تھا کہ حکومت اور پارٹی نے ہمیں

سب کچھ دیا ہے، صرف ہمارا ایک حق چھین لیا ہے، اور وہ ہے ہمارا یہ حق کہ ہم بُرا لکھ سکتے ہیں ـــــ بُری تحریر لکھنے کا حق، جس نے اپنے لیے ایک نئی ادبی صنف وضع کی تھی: خاموشی کی صنف؛ جورج لوئی بورخے جس نے خون و ہوس کے عہد میں اس خالصتاً عبقری کہانی کو لکھا جس کی لیبرنتھ میں خوابوں کے چیتے مچلیں اور ساری کائنات کا علم ایک کتاب میں سمٹتا دکھائی دے؛ آئزک باشیوس سنگر جس کو گمان ہے کہ ساری دنیا، تمام تارے، تمام سیارے ایک الوہی تاریخ کے نمائندے ہیں اور ایک منبعِ حیات کے، ایک ناقابل اختتام اور حیرت انگیز کہانی جو پوری کی پوری صرف خدا ہی کو معلوم ہے؛ اور میرے استاد محمد حسن عسکری جن کا ایک جملہ ان کہانیوں کی تصنیف کے دوران میرے کانوں میں رہ رہ کر گونجتا رہا کہ کہانی کا نیریشن کلچر سے آتا ہے، نیریشن میں زبان کا مزاج رچا بسا ہوتا ہے۔

تو یہ ہیں میری کہانیاں اور یہ ہے ان کا فریم آف ریفرنس۔ اب آگے آپ جانیں آپ کا کام، میں تو تماشہ سمیٹ اور پٹارا بند کر کے چلا، مگر چلتے چلتے دوہا اپنی بولی کا ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو ندیس

۶ ستمبر ۱۹۸۱

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد ... انجمن ترقی اردو ...
... جاتی ہے

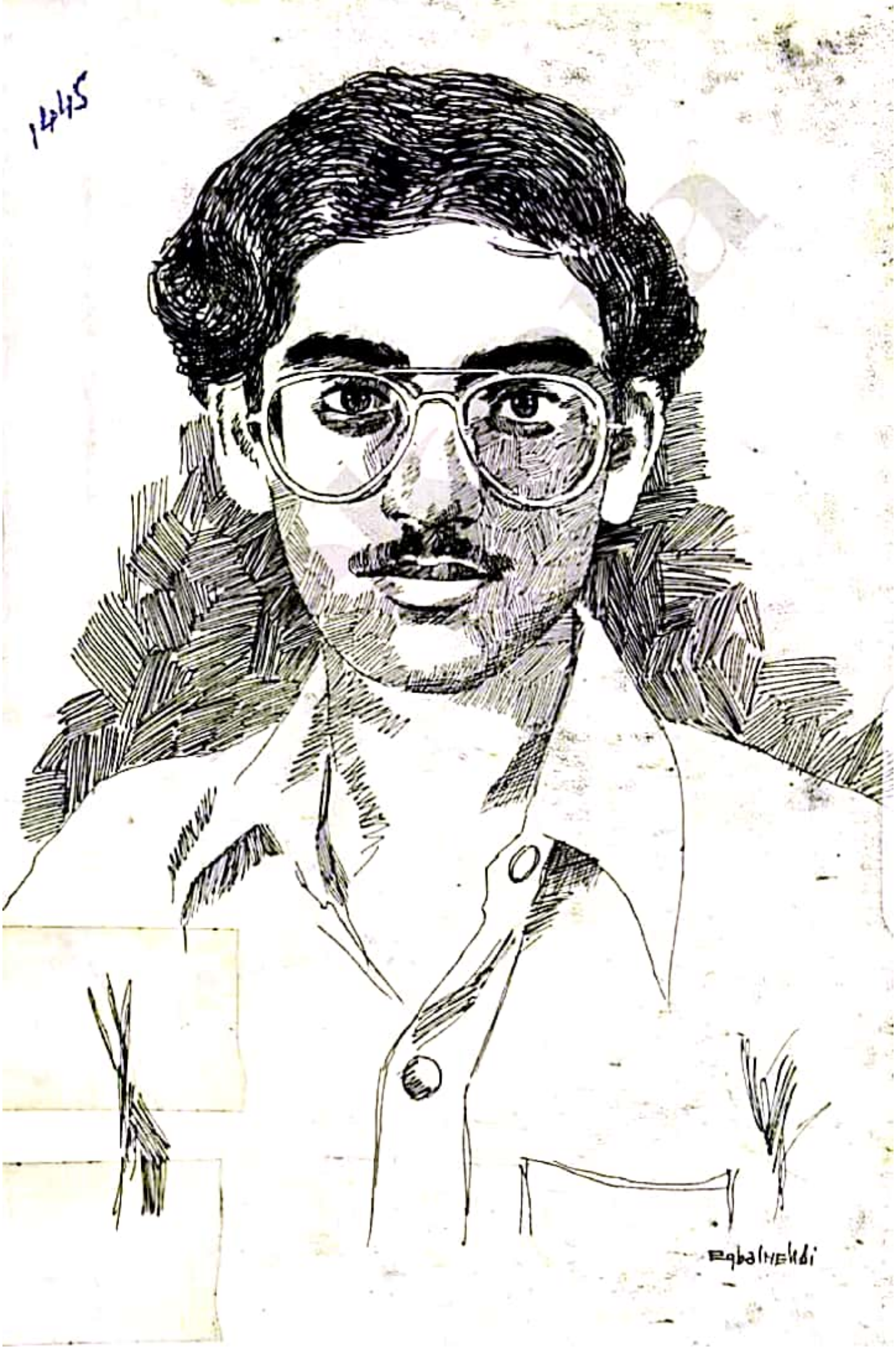

Scanned with CamScanner